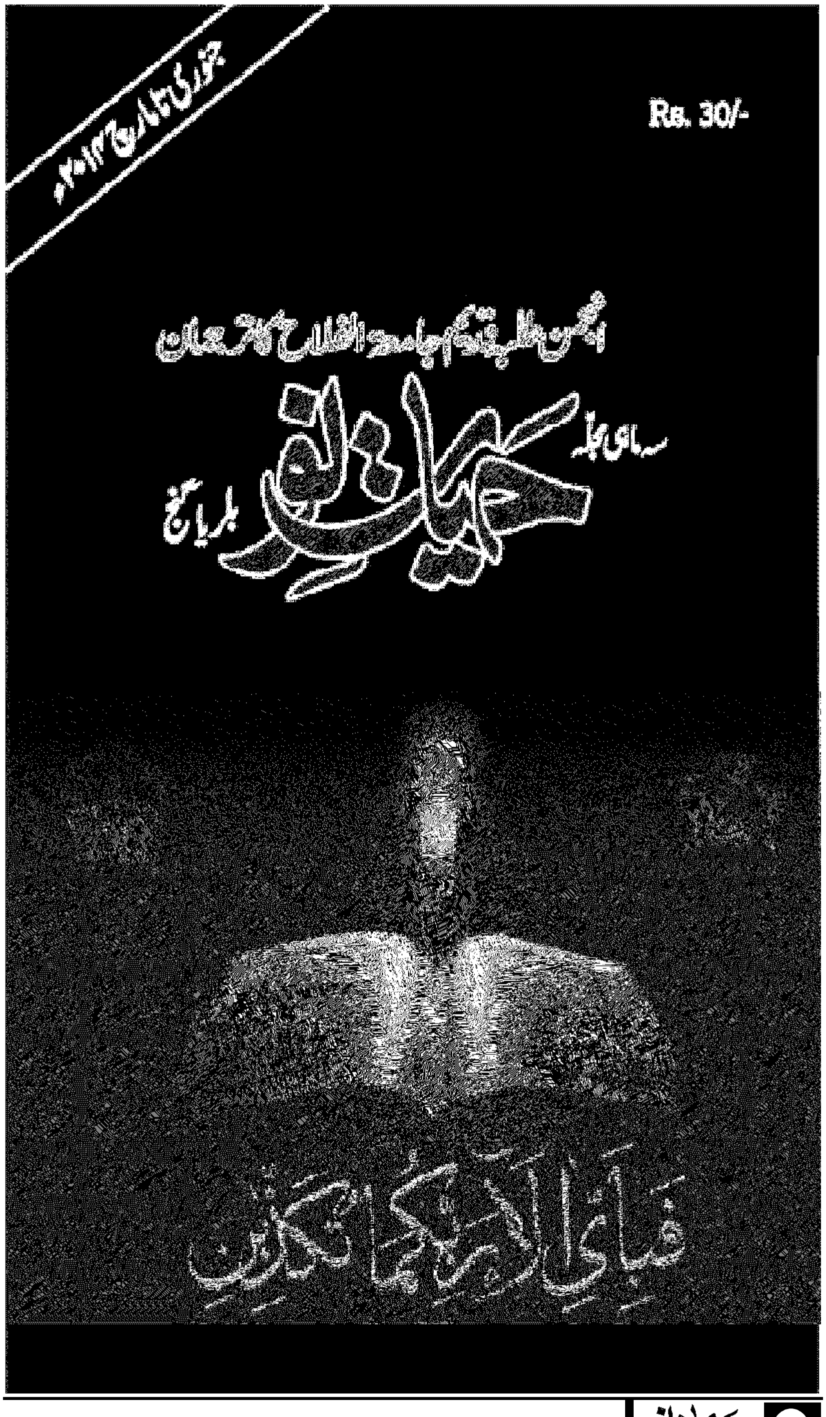

جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء
Rs. 30/-
انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان
سہ ماہی مجلہ
حیاتِ نو
بلریاگنج
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

حیاتِ نو

جلد: ۲۸، شمارہ: ۱، جنوری-مارچ ۲۰۱۴ء / صفر المظفر - جمادی الاول ۱۴۳۵ھ

مدیر: ابوالاعلیٰ سید سبحانی

مجلس ادارت:

اشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ضمیر الحسن خان فلاحی	علی گڑھ
مولانا محمد اسماعیل فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ:	اندرون ملک	۳۰؍روپے
	بیرون ملک	۵؍امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون:	اندرون ملک	۱۲۰؍روپے
	بیرون ملک	۲۰؍امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ:	اندرون ملک	۳۰۰۰؍روپے
	بیرون ملک	۲۰۰؍امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

نمائندے

لندن	رضوان احمد فلاحی
دہلی	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی	حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال	نذر الحسن فلاحی
یو.اے.ای.	خالد حسن رشید فلاحی
قطر	محمد اکرم فلاحی
کویت	محمد سموئیل فلاحی
سعودی عرب	انعام اللہ فلاحی

خط وکتابت کے پتے

برائے ادارتی امور
ابوالاعلیٰ سید سبحانی، نئی دہلی
abulaalasubhani@gmail.com
+91-9891051676

برائے انتظامی امور وترسیل زر
عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی) 276121
+91-9453757380
hayatenau5@gmail.com

نقوشِ حیات

اداریہ	ابوالاعلیٰ سید سبحانی	۵
حمد باری تعالیٰ	سید راشد حامدی فلاحی	۷
کیا قرآن میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے؟	نسیم احمد غازی فلاحی	۸
ہمارے زمانے کا جامعہ	محمد الیاس فلاحی	۱۰
اعتدال اور توازن	اشتیاق عالم فلاحی	۱۴
میڈیا کے بڑھتے اثرات اور مدارس کی ذمہ داریاں	قاسم سید (فلاحی)	۱۹
	ڈاکٹر محمد ارشد فلاحی	۲۲
	شمشاد حسین فلاحی	۲۳
	صداقت حسین فلاحی قاسمی	۲۴
	ممتاز عالم فلاحی	۲۷
	ڈاکٹر ملک راشد فیصل	۲۹
	دانش ریاض فلاحی	۳۲
	اظہر رفیقی فلاحی	۳۵
	محمد ثاقب	۳۸
اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳)	ڈاکٹر محی الدین غازی	۴۱
اسلامی نظریہ ونصاب تعلیم اور معلم ودانش گاہ	ڈاکٹر وسیم احمد فلاحی	۵۳
فلسطینی بچوں کی موجودہ صورتحال	فہیم احمد فلاحی	۵۷
نظم ''چند روز اور مری جان!'' ایک جائزہ	ثاقب عمران فلاحی	۶۰
تعارف وتبصرہ	عبدالرحمٰن خالد فلاحی	۶۵
آپ کے خطوط	قارئین	۷۰
جامعہ کے لیل ونہار	مصباح الباری فلاحی	۷۷
اخبار انجمن	ادارہ	۸۱

اداریہ

اپنی بات

دینِ اسلام میں شناخت (مذہبی تشخص) اور روح (مذہبی اسپرٹ) دونوں کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے، اور یقیناً دونوں لازم وملزوم کا رشتہ رکھتی ہیں کہ وہ ایمان ہی کیا جس کا انسان کی شخصیت پر کوئی اثر نظر نہ آئے، تاہم دونوں میں واضح فرق کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔

شناخت کا تعلق انسان کے عمل اور تہذیبی مظاہر سے ہے، جبکہ روح کا تعلق اس کے قلب وذہن اور ایمان ویقین سے ہے۔ روح کی یافت کے نتیجے میں مطلوبہ شناخت کا حصول ممکن بلکہ آسان ہوجاتا ہے، جبکہ محض شناخت پر اصرار یا اس کے حصول پر توجہ مرکوز کردینے کی صورت میں روح تک رسائی ہونا، امر محال نہیں تو امر مشکل ضرور ہے۔

شریعت میں شناخت فی نفسہ مقصود ہے، یہ ایک حقیقت ہے، لیکن اس کو کہاں تک وسعت دی جاسکتی ہے، اس پر گفتگو ممکن ہے، تاہم روح کے سلسلے میں کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔

روح (مذہبی اسپرٹ) کے حصول کے نتیجے میں انسان کے قلب وذہن میں ایک ایسی تحریک وجود میں آتی ہے، جو اسے اپنے مقصد کے حصول کے لئے ہمہ تن بے چین اور مضطرب رکھتی ہے، اور وہ سیماب صفت بن جاتا ہے۔ جبکہ محض شناخت یعنی بے روح مذہبی تشخص پر اصرار کے نتیجے میں جمود کی ایک ایسی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، جو اس کے ذہن وفکر کو منجمد اور اس کے قویٰ کو اضمحلال کا شکار بنادیتی ہے، اور پھر وہ مسلسل پسماندگی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس حقیقت کا مشاہدہ انفرادی سطح پر بھی کیا جاسکتا ہے اور اجتماعی سطح پر بھی۔ افراد ہوں یا ادارے اور تحریکیں، جب ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ شناخت کا تحفظ اور اس کی تبلیغ واشاعت بن جاتا ہے، تو وہ اسی میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، پھر اُن کی ساری تگ ودو اور جد وجہد، انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی، اسی میں سمٹ کر رہ جاتی ہے، اور وہ اپنے اصل مشن سے پیچھے ہٹتے چلے جاتے ہیں۔

اس کے بالمقابل جو افراد یا ادارے شناخت کے بجائے روح کے حصول پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے ہیں، ان کے شب وروز مختلف ہوتے ہیں، وہ اِس روح کو سماج کے دوسرے عناصر تک منتقل کرنے کے لیے دن رات ایک کردیتے ہیں۔

وہ اپنی ذات میں سمٹ کر نہیں رہ جاتے، بلکہ اُن کے پیش نظر انسانوں کا ایک لامتناہی قافلہ ہوتا

ہے، اورالٰہی ہدایات کے مطابق اُس قافلے کی رہنمائی کرنا، وہ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں۔

روح کے حصول کے بعد منزل بالکل صاف اور واضح ہوجاتی ہے، اور راستے خود بخود نکلتے چلے جاتے ہیں، اور رہرو کے سامنے کوئی رکاوٹ اہمیت نہیں رکھتی، اور کسی بھی قسم کی سازشیں اور چیلنجز اس کا راستہ روکنے میں کامیاب نہیں ہو پاتے، جبکہ شناخت پر ارتکاز کے نتیجے میں چونکہ شناخت کا تحفظ اصل مسئلہ بن جاتا ہے، اس لیے قدم قدم پر مسائل اور رکاوٹیں پیش آتی ہیں، اور وہ ان میں بری طرح الجھ کر رہ جاتا ہے۔

بد قسمتی سے وطن عزیز کے ملی اداروں اور جماعتوں کی سرگرمیوں میں روح کی جگہ شناخت پر زیادہ توجہ نظر آتی ہے، چنانچہ دیکھتے ہیں کہ وطن عزیز میں مسلم تشخص کے تحفظ اور اس تشخص کی اشاعت وتبلیغ میں مدارس اسلامیہ اور مختلف مسلم جماعتوں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے، ملی مسائل بالخصوص تشخص سے متعلق مسائل کے حل کے سلسلے میں آواز اٹھانے اور ملت کے حقوق اور مطالبات کے لیے جدوجہد میں ان کا اہم رول رہا ہے، یقیناً اِن سب چیزوں کی اپنی اہمیت وافادیت ہے جس سے انکار نہیں، لیکن قرآن وسنت کی روشنی میں حقیقتِ واقعہ کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اصل مطلوب، ملت کے لئے، بالخصوص ملت کے مدارس اور جماعتوں کے لیے، قطعی طور پر اس سے مختلف ہے۔

اصل مطلوب پر گفتگو سے پہلے ضروری ہے کہ امت اسلامیہ کی بنیادی حیثیت اور اس کے مقام ومرتبہ پر از سرنو غور وفکر سے کام لیا جائے کہ اس کو خیر امت اور امت وسط قرار دینے کا بنیادی سبب کیا ہے، اور اس کے تقاضے اور مطالبات کیا ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ملکی سماج کے خدوخال کو بھی ذہن میں تازہ کرلیا جائے، جو مذہبی، ثقافتی، لسانی اور علاقائی غرض مختلف پہلوؤں سے اپنے اندر ایک عجیب وغریب قسم کا تنوع رکھتا ہے، اور جس سے مسلمانوں کی مختلف پہلوؤں سے ایک بہت ہی تاریخی نوعیت کی وابستگی رہی ہے۔ مذکورہ بالا دونوں امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے شناخت (مذہبی تشخص) اور روح (مذہبی اسپرٹ) کے مسئلے پر غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ امت اسلامیہ کے لیے روح (مذہبی اسپرٹ) کا حصول اور حصول کے ساتھ ساتھ خیر امت ہونے کے لازمی تقاضے کے طور پر اس روح کی اشاعت وتبلیغ نہ صرف اصل مطلوب کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ شناخت اور روح کے درمیان بہت ہی توازن اور اعتدال کا رویہ اختیار کیا جائے۔

اس وقت ملت کے ہر ادارے کے پاس، خواہ وہ مدارس ہوں یا جماعتیں اور تنظیمیں، اپنا ایک مخصوص ایجنڈا ہے، کچھ مطالبات ہیں اور کچھ شکایات، لیکن اصل مطلوب جس کی عنداللہ جوابدہی پر بلاتفریق سب کا ایمان ہے، اس سلسلے میں کس کے پاس کیا ایجنڈا ہے؟ یہ ایک بڑا سوال ہے۔

ابوالاعلیٰ سید سبحانی

حمد باری تعالیٰ

سانسوں پہ، دھڑکنوں پہ تجھے اختیار ہے
اللہ تیرا ذکر ہی وجہ قرار ہے
آئینہ حیات سے یہ آشکار ہے
تو ہی تو کائنات کا پروردگار ہے
بار الہ تو ہے سزاوار ہر صفت
یکتا ہے، لاشریک ہے، ذی اقتدار ہے
حق ثنائے پاک میں کیسے ادا کروں
عاجز زباں ہے میری، قلم بھی فگار ہے
بچوں کو مت سنایئے جھوٹی حکایتیں
یہ چاند بھی خدا کا عبادت گزار ہے
''ق''
چرخہ نہیں ہے، ہاتھ میں تسبیح ہے میاں
لگتا ہے کوئی عابد شب زندہ دار ہے
روشن ہیں تیرے نام سے مہر ومہ ونجوم
جگنو بھی تیرے نور کا نامہ نگار ہے
لب لباب یہ ہے کہ وحدت پرست ہوں
بار الہ آگے تجھے اختیار ہے
راشد صمیم قلب سے آواز دے کے دیکھ
شہ رگ سے بھی قریں، ترا پروردگار ہے

سید راشد حامدی فلاحی، دہلی

کیا قرآن میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے؟

نسیم احمد غازی فلاحی، مدھر سندیش سنگم، نئی دہلی

ایک روز مجھے شہر کے باہری علاقے میں ایک صاحب سے ملاقات کے لئے جانا پڑا۔ میں نے یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے شاید واپسی میں وہاں کوئی رکشہ نہ ملے، رکشے والے سے آمد و رفت کا معاملہ کر لیا اور اس میں بیٹھ کر منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں اس رکشے والے کے حالات بھی معلوم کرتا رہا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے، کتنے بچے ہیں اور وہ کیا کیا کرتے ہیں وغیرہ۔ میں نے مختصراً اپنا تعارف بھی کرایا۔ اس طرح لمبا راستہ بھی آسانی کے ساتھ طے ہو گیا اور اس سے ایک طرح کی انسیت بھی ہو گئی۔

منزل پر پہنچنے کے بعد میں نے رکشے والے کو باہر چھوڑ دیا اور گھر میں داخل ہو گیا۔ صاحب خانہ نے چائے وغیرہ سے میری تواضع کی۔ میں نے ان سے کہا کہ ''میرا ایک ساتھی بھی باہر موجود ہے اسے بھی اس تواضع میں شریک کر لیں''۔ ان صاحب نے فوراً تعجب سے کہا کہ ''آپ کا ساتھی کہاں ہے؟ اسے آپ اندر کیوں نہیں لائے؟'' میں نے عرض کیا کہ ''وہ ساتھی اپنے رکشے کی نگرانی کر رہا ہے''، وہ میری بات سمجھ گئے۔ چنانچہ انہوں نے اس رکشے والے کے لئے باہر ہی چائے وغیرہ بھجوا دی۔ اس رکشے والے نے سمجھا کہ یہ میرے لئے آیا ہے، اس لئے اس نے میزبان سے کہا کہ صاحب تو اندر ہی گئے ہیں، اس پر میزبان نے اس سے کہا کہ یہ آپ کے لئے ہے۔ یہ سن کر پہلے تو وہ جھجکا لیکن میزبان کے اصرار پر اس نے چائے ناشتہ کر لیا۔

چند منٹ کی گفتگو کے بعد میں طے شدہ معاملے کے تحت اسی رکشے سے واپس لوٹا۔ واپسی میں میں نے محسوس کیا کہ وہ رکشے والا ہمارے سلوک سے کافی متأثر ہے، میں نے دیکھا کہ راستے کے اتار چڑھاؤ پر وہ اب کافی شفقت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اگر کسی چڑھائی پر میں نے رکشے سے اترنے کی کوشش کی تو اس نے سختی سے منع کر دیا، اور رکشے میں بیٹھے رہنے پر اصرار کیا۔ بہرحال اپنی منزل پر پہنچ کر میں نے طے شدہ رقم رکشے والے کو پیش کی، لیکن اس نے نہایت ادب اور عاجزی کے ساتھ پیسے لینے سے

انکار کر دیا، اس پر میں نے اس سے کہا کہ بھائی میں تو طے شدہ پیسے آپ کو دے رہا ہوں، اگر کم ہوں تو اور دے دیتا ہوں۔ اس پر وہ بڑی احسان مندی کے انداز میں کہنے لگا: ''صاحب! آپ نے تو ہمیں بہت کچھ دے دیا ہے، ہمیں تو لوگ دھتکارتے ہیں، نیچ اور جانور سمجھتے ہیں، ذرا سی بات پر گالی دینا اور مارنا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ نے میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس سے مجھے بہت کچھ مل گیا ہے۔ میں آپ سے پیسے نہیں لے سکتا۔''

بات واضح تھی کہ وہ پیسے لینے سے انکار کیوں کر رہا ہے، چنانچہ میں نے کہا کہ بھائی! ہم نے آپ کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ تو ہمارا فرض تھا۔ آپ میرے ساتھ تھے اور اللہ کی کتاب قرآن مجید نے ہم مسلمانوں کو یہ ہدایت دی ہے کہ اپنے ساتھی کے ساتھ حسن سلوک کرو اور اس کا حق اسے دو، چاہے اس کا ساتھ وقتی اور تھوڑی دیر کا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے ہم نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اور نہ آپ کی اجرت سے اس کا کوئی لینا دینا ہے۔

یہ بات سن کر وہ غیر مسلم رکشے والا بڑی حیرت سے بولا: ''کیا قرآن میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے؟ تب تو قرآن کی باتوں پر تمام انسانوں کو چلنا چاہئے۔ اور یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اسے بتایا کہ بھائی قرآن مجید سارے انسانوں کے خالق، مالک اور پروردگار کی جانب سے سارے ہی انسانوں کے لئے بھیجا گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے پیسے زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیئے اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

میں سوچنے لگا کہ قرآن مجید کی جن تعلیمات کو ہم معمولی سمجھ کر کوئی اہمیت نہیں دیتے، ان کے اندر اتنی حکمت اور اس قدر تاثیر موجود ہے۔ واقعی قرآن خدا کا کلام ہے۔ البتہ مجھے اس کا افسوس رہا اور آج بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بڑا افسوس ہوتا ہے کہ مجھے اس رکشے والے کا پتہ لے لینا چاہئے تھا تاکہ بعد میں اس سے دعوتی ربط رکھا جا سکتا۔

ہمارے زمانے کا جامعہ

محمد الیاس فلاحی، کپل وستو، نیپال

(گزشتہ شمارے میں پہلے بیچ ۱۹۶۷ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے بھائی مولانا ابوالمکارم فلاحی نے اپنے زمانہ طالب علمی کی کچھ یادیں اور تأثرات ہمارے ساتھ شیئر کیے تھے، اس ماہ ۱۹۶۸ء میں فضیلت سے فارغ ہونے والے ہمارے ایک بھائی کی تحریر پیش خدمت ہے۔ ان شاء اللہ اس کالم سے ہمارے لیے ابتدائی دور کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے، ابتدائی لوگوں کے خوابوں اور تمناؤں سے آشنا ہونے، اس کی روشنی میں حال کا جائزہ لینے اور مستقبل کے لیے منصوبہ بندی کرنے میں آسانی ہوگی۔ **مدیر)**

میں سراج العلوم السّلفیہ جھنڈا نگر نیپال میں زیر تعلیم تھا جو میرے علاقہ میں ایک مرکزی تعلیمی ادارہ ہے۔ اسی دوران میرے بڑے بھائی محمد رضا خاں مرحوم ایک دن تفہیم القرآن لے کر آئے۔ ان کے دستِ مبارک سے سید مودودی علیہ الرحمۃ کی شاہکار تفسیر 'تفہیم القرآن' کا پہلا ایڈیشن حاصل کیا، اسے دیکھا اور پڑھا تو بہت متأثر ہوا۔ میں نے اپنے بھائی صاحب کے سامنے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں تحریک اسلامی کے کسی ادارہ میں تعلیم حاصل کروں گا۔ اس وقت میری عمر سولہ یا سترہ سال تھی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ایک دن بھائی صاحب نے کہا کہ اعظم گڑھ علاقے میں ایک جگہ جماعت اسلامی کا ادارہ کھلا ہے۔ اچھی اور اعلی تعلیم کے لیے تم کو وہیں جانا ہے۔ کیوں کہ جماعت اسلامی ہند ایک ایسی جماعت ہے جو مسلکی اور فقہی اختلافات سے بالاتر ہو کر دعوتِ اسلامی کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اسی جماعت کے تحت وہ ادارہ ابھی ابھی شروع ہو رہا ہے۔ جہاں جماعت کے بڑے بڑے علماء تدریس کے لیے موجود ہیں۔

غرض ۱۹۶۴ء میں بھائی مرحوم کے ہمراہ جامعۃ الفلاح گیا۔ نیپال سے گورکھپور کے راستے مئو بذریعہ ٹرین گیا، پھر مئو سے بذریعہ بس اعظم گڑھ اور پھر بذریعہ تانگہ بلریا گنج ۲/دن میں پہنچا۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے میرا ٹسٹ لیا، اور عربی چہارم میں میرا داخلہ ہوگیا۔ پھر ۱۹۶۸ء میں

جامعہ سے سند فضیلت حاصل کی، ہمارا بیچ جامعہ کا دوسرا بیچ ہے۔فلاح میں اس وقت نیپال سے میں اکیلا طالب علم تھا۔

جامعۃ الفلاح میں کچھ ہی عرصہ رہنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ الحمدللہ میں نے بہت اچھا فیصلہ کیا۔اگر جامعۃ الفلاح نہ آیا ہوتا تو تحریک اسلامی کو سمجھ پاتا نہ اقامت دین کے نبوی مشن سے اس طرح واقف ہو پاتا اور نہ اس طرح اجتماعیت کا صحیح اسلامی شعور ہی مجھے حاصل ہو پاتا۔

ہمارے زمانے میں جامعۃ الفلاح حقیقت میں بالکل ابتدائی مرحلے میں تھا۔عربی شعبے میں طلبہ کی تعداد ڈیڑھ سو(۱۵۰ر) تھی، جبکہ کل اساتذہ ۱۲ر تھے۔

اس وقت عمارتوں میں صرف موجودہ مودودیؒ منزل تھی، اور وہ بھی صرف ایک منزلہ عمارت تھی۔ جس میں ایک ہال، پانچ چھ کمرے اور برآمدہ تھا۔ ہال میں عربی درجات کی تین کلاسیں لگتی تھیں، باقی کلاسیں برآمدے میں ہوتی تھیں۔بغل کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں اساتذہ اور طلبہ کی رہائش تھی۔ مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، اور مولانا جلیل احسن ندویؒ کے کمروں سے بھی کلاس روم کا کام لیا جاتا تھا۔کبھی طلبہ کی تعداد زیادہ ہوتی تھی تو بعض طلبہ، اساتذہ کے کمروں میں رہائش اختیار کرتے تھے۔ بہت تنگی کا زمانہ تھا۔مودودی ہال سے متصل اتر جانب کھپریل کا ایک مکان تھا جس میں مکتب کے طلبہ پڑھتے تھے۔ مسجد بھی نہیں تھی۔ہم لوگ ہال میں ہی پنجوقتہ نمازیں ادا کرتے تھے۔آخر زمانے میں مسجد کی بنیاد ڈال دی گئی تھی۔جس میں الحمدللہ ہم لوگوں نے کافی محنت کی، بنیاد کی کھدائی، اینٹیں مٹی وغیرہ ڈھونا، مٹی پاٹنا اور دیگر تمام کاموں میں حصہ لیا۔آج جامعہ کی وسیع وعریض مسجد دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔

'حسن البنا منزل' کے بعض کمرے بھی آخر میں بن گئے تھے، روم نمبر ار میں میری رہائش تھی۔اس میں میرے ساتھ چار دیگر طلبہ دوست اور تھے، ابوالمکارم فلاحی ازہری صاحب، حبیب احمد جمالی صاحب، مشرف حسین صدیقی صاحب، اور عبدالوحید بستوی صاحب۔

اس وقت بہت غربت کا زمانہ تھا۔کھانا بالکل ہلکا پھلکا ہوتا تھا۔اس علاقہ کی مناسبت سے جو اور گیہوں سے بنی ہوئی روٹی، نمک مرچ اور پانی والی چٹنی، ناشتہ اور دو وقت کا کھانا ملتا تھا۔کھانے کا اجتماعی نظم تھا۔طلبہ کی باریاں مقرر تھیں۔اساتذہ کی نگرانی ہوتی تھی۔طعام فیس ماہانہ ۲۰ر یا ۲۵ر روپے تھی۔

طلبہ اور اساتذہ کے درمیان خوشگوار ماحول تھا۔اساتذہ والدین کی طرح شفقت کرتے اور ہم بھی اساتذہ کی خدمت کرنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔اساتذہ نے ہمارے اوپر کبھی مارنے کے لیے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ وہ ہمیں بغیر کسی اضافی فیس کے درس کے علاوہ پورا پورا وقت دیتے تھے۔ جب چاہئے ان سے استفادہ کیجئے۔

میرے مشفق اور لائق اساتذہ کرام میں مولانا جلیل احسن ندویؒ، مولانا شہباز اصلاحیؒ، مولانا صغیر احسن اصلاحیؒ، مولانا عبدالعلیم اصلاحی، اور مولانا عبدالحسیب اصلاحی ہیں، جن میں آخر الذکر دونوں اساتذہ کرام ابھی باحیات ہیں۔ مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب نے سید مودودی منزل کے کنارے چھوٹے والے کمرے میں اپنی زندگی کا لمبا عرصہ گزار دیا۔ بڑے مخلص اور مشفق استاذ تھے۔ مولانا جلیل احسن ندویؒ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں اکثر ان کے لیے چائے بناتا، ان کے جوتے صاف کرتا، ان کے روم کی صفائی کرتا۔ وہ بہت ہی نفیس انسان تھے۔ ان سے میں نے کافی استفادہ کیا۔ یہ اساتذہ مدرستہ الاصلاح سرائمیر سے آئے تھے، اور صرف تحریک کو زندہ کرنا اور اس کے لیے اچھے طلبہ تیار کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔

جامعہ کا تعلیمی اور تربیتی ماحول بہت اچھا تھا۔ ہر فرد کو معلوم تھا کہ یہ تحریکی ادارہ ہے، یہاں تحریک اسلامی کے لیے افراد سازی کا کام کیا جاتا ہے، طلبہ کے ذہنوں میں تحریک اسلامی کی روح ڈالی جاتی ہے، اور عام احساس تھا کہ طلبہ تعلیم سے فارغ ہوں گے تو جماعت سے وابستہ ہوکر دعوت کا کام کریں گے۔ سید مودودی منزل میں ہفتہ وار پروگرام ہوتا تھا۔ جس میں ہم حصہ لیتے تھے۔ اسی پروگرام سے ہم نے تحریک کو سمجھا اور جانا تھا۔

ذمہ داران جامعہ ہمیشہ جامعہ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے فکرمند دکھائی دیتے تھے۔ مالی تعاون کے لیے وہ قرب وجوار کا سفر کرتے تھے۔ اس وقت خلیج کا دروازہ نہیں کھلا تھا۔ البتہ اس علاقے کے لوگ معاش کے لیے ملیشیا جایا کرتے تھے۔ وہ بھی جامعہ کا بھرپور تعاون کرتے تھے۔ ماسٹر ادریس صاحب (اللہ ان کو غریق رحمت کرے) بہت محنت کرتے تھے۔ ان کے روابط بہت اچھے تھے۔ وہ اکیلے جامعہ کے لیے اتنا کچھ مالی تعاون حاصل کرلاتے جس سے تقریباً سارا خرچ نکل جاتا تھا۔

بلریا گنج اور قرب وجوار کے لوگ جامعہ کے بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جامعہ کی ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ طلبہ واساتذہ سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم کا معمول تھا کہ وہ روزانہ اپنی گاڑی سے آتے اور بیمار طلبہ کا علاج کرتے تھے۔ وہ اساتذہ اور طلبہ کا ہمیشہ مفت علاج کرتے تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ایک بار مجھے پھوڑا ہوگیا تھا، تو حکیم صاحب مرحوم روزانہ اپنی گاڑی سے آتے اور مرہم پٹی کرجاتے تھے۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے۔ حکیم صاحب اتنی بڑی شخصیت کے مالک تھے پھر بھی طلبہ کی دیکھ بھال کے لیے خود آیا کرتے تھے۔

جامعہ کے سلسلے میں اس وقت ہمارا خواب تھا، اور ہم اس کے لیے دعائیں بھی کرتے تھے کہ اللہ جامعہ کو شمالی ہند میں تحریک اسلامی کا ایک مثالی ادارہ بنادے۔ اس کی حیثیت ایک یونیورسٹی کی ہوجائے،

جہاں سے بڑی تعداد میں ہر سال تحریک کے لیے کارکنان کی ایک ٹیم تیار ہو۔ جو اعلیٰ تعلیم اور حسن اخلاق سے مزین ہو، اور ان کے ہاتھوں اس ملک میں بڑے پیمانے پر دعوت دین کا فریضہ انجام پائے۔ الحمدللہ ہمارا یہ خواب مکمل تو نہیں البتہ بارآور ہوتا نظر آرہا ہے۔ جامعۃ الفلاح ملک میں اپنی ایک شناخت بنا چکا ہے، اور آج بھی اسے ہندوستان کے ایک عظیم تحریکی ادارے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

جامعۃ الفلاح دیگر اداروں کے بالمقابل کئی پہلوؤں سے ممتاز ہے۔ یہاں کے فارغین اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، اور ان کی کارکردگی صرف درس وتدریس ہی نہیں جملہ شعبہ ہائے حیات میں نمایاں ہے۔ وہ دعوت کے میدان میں اچھے داعی، اصلاح معاشرہ کے میدان میں سرگرم مصلح اور خطیب، صحافت کے میدان میں اچھے صحافی، درس وتدریس کے میدان میں اچھے مدرس، اس کے علاوہ معاشیات اور طب کے میدان میں فلاحی برادران ملک وبیرون ممالک میں اچھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جامعہ ایک تحریکی ادارہ ہے جہاں تعلیم کے ساتھ طلبہ کو امت مسلمہ کے مقصد وجود سے روشناس کرایا جاتا ہے، اور اجتماعیت کے ساتھ زندگی گزارنے کا شعور دیا جاتا ہے۔

میری دعائیں اور نیک خواہشات اس ادارے کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ادارے کے فارغین کو ملک وملت کے لیے مفید تر بنائے اور ذمہ دارانِ جامعہ کو توفیق دے کہ وہ جامعہ کی تعلیمی واخلاقی، تربیتی وتحریکی، دعوتی واصلاحی ہر اعتبار سے ترقی اور تحسین کا عمل جاری رکھیں۔ آمین

●●

بقیہ: اسلامی نظریہ ونصاب تعلیم اور معلم ودانش گاہ

یہی تقاضا ہے عصر حاضر کا، یہیں سے علیحدگی پسندی کا الزام بھی رفع ہوگا، اور شفافیت کا بھی بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔

دانش گاہ کی اندرونی فضا کا محور طالب علم کی ذات ہو، فرداً فرداً، دیگر تمام اعتبارات بمنزلہ صفر کے ہوں۔ گروہی نسبتوں پر نگاہ غلط انداز بھی نہ پڑتی ہو۔ تاکہ طالب علم کی انفرادیت کا پورا پورا اظہار ہوسکے اور اس کے اندر احترام بدرجہ اتم پیدا ہو۔ اسے یہ محسوس ہو کہ وہ فی نفسہ مطلوب ہے۔ اس راستہ کی مزاحمتیں کیا کیا ہیں ان کا جائزہ لینا ہوگا۔ تعلیم کے ان چاروں عناصر پر بیک وقت نگاہ اور ان پر مزید غور وخوض ایک خوش آئند مستقبل کی طرف سفر کے آغاز کے ہم معنی ہے۔

●●

اعتدال اور توازن

(اسلامی زندگی کی ایک اہم خصوصیت)

اشتیاق عالم فلاحی، حال مقیم قطر

توازن اسلامی زندگی کی ایک انتہائی اہم خصوصیت ہے۔شریعت نے احکام اور ہدایات کی شکل میں زندگی کے جملہ معاملات سے متعلق رہنمائی بھی فراہم کی اور فرد سے ان معاملات میں کیا کردار مطلوب ہے اس کی وضاحت بھی کی۔شرعی تعلیمات کی خصوصیات پر اگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ توازن شریعت کی ایک اہم خصوصیت ہے۔اس میں صریح انداز میں راہِ توازن اختیار کرنے کی تلقین بھی ہے، اور اس کی اہمیت بھی بیان کی گئی ہے۔اسی طرح شریعت کی تعلیمات اور مطالبات میں بھی پورا پورا توازن ملتا ہے۔قرآنِ کریم کی وہ آیت جس میں امت مسلمہ کے فرضِ منصبی کی وضاحت کی گئی ہے، اس میں فرض کی وضاحت سے پہلے امت مسلمہ کا وصف ہی یہ بیان کیا گیا کہ تم وہ امت ہو جس کا اساسی کردار امت وسط ہونا ہے۔ وکذلك جعلناکم امّة وسطا لتکونوا شهداء علیٰ الناس و یکون الرسول علیکم شهیدا۔ (سورۃ البقرۃ:143)(اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو، اور رسول تم پر گواہ رہیں)،فرد اگر توازن اور اعتدال کا دامن چھوڑتا ہے تو کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں جو فرد کے انتہائی مجرمانہ راستے پر چلنے کے لئے دروازہ کھولتی ہیں یا پھر غلو کا وہ راستہ کھلتا ہے جس نے اہل کتاب کو منصب امامت سے معزول کر کے مغضوب اور ضالّین کی صف میں شامل کر دیا۔اہل کتاب کو خطاب کر کے کہا گیا: یا اهل الکتاب لا تغلوا فی دینکم۔(سورۂ نساء: آیت:71)''اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔''

عبادات میں توازن

عبادات بندے کو رب سے قریب کرتی ہیں۔احکامِ خداوندی کی پابندی بندۂ مومن کے لئے سکون وطمانیت کا ذریعہ ہوتی ہے۔رب کے سامنے اپنی پیشانی جھکا کر بندے کے اندر سارے جہاں سے بے نیازی کی شان اور مخلوقِ خدا کے لئے محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔اس کے اندر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ کافی

ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے۔ اس عبادت کے سلسلہ میں بھی شریعت نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ بندہ غیر متوازن طریقہ اختیار کرے۔ عبادات سے بے پروائی یقیناً قابل مواخذہ ہے لیکن عبادات میں غلو بھی پسندیدہ نہیں۔ تین اصحاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کا حال معلوم کیا۔ اسے جاننے کے بعد انہیں محسوس ہوا کہ ان کی اپنی عبادتیں بہت کم ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں ہمیشہ روزے رکھوں گا۔ دوسرے نے کہا کہ میں ہمیشہ رات بھر نماز پڑھوں گا۔ ایک اور صحابی نے کہا کہ میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں سے دریافت فرمایا کہ کیا تم لوگوں نے اس طرح کی باتیں کہی ہیں؟ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ میں روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، میں شادی بھی کرتا ہوں۔ جو میری سنت سے اعراض کرے گا وہ ہم میں سے نہیں۔'' (بخاری:116/6) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے کہا کہ فلاں صاحب نمازِ فجر طویل پڑھاتے ہیں۔ میں ان کی وجہ سے نماز میں دیر سے پہونچوں گا۔ حدیث کے راوی ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی اور موقع پر اتنے زیادہ غصّے میں نہیں دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: لوگو!! کچھ ایسے لوگ ہیں جو لوگوں کو (دین سے) دور کر رہے ہیں۔ تم میں سے کوئی بھی امامت کرے تو وہ اختصار سے کام لے کیونکہ تمہارے پیچھے عمر رسیدہ افراد بھی ہوتے ہیں، ضعیف بھی ہوتے ہیں، اور ضرورت مند بھی۔ (بخاری: جلد:1 صفحہ:172)۔

انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ سلم نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو اپنے دو بیٹوں کے درمیان گھسٹتا جا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ آخر کیا معاملہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ: اس نے پیدل جانے کی نذر مانی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ تم اپنے آپ کو عذاب میں مبتلا کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سوار ہو کر جانے کا حکم دیا۔ (بخاری: جلد:7 صفحہ:234) ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین میں غلو سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے کے لوگوں کو دینی معاملات میں غلو نے ہلاکت میں ڈال دیا۔ (نسائی: حدیث نمبر:3057، ابنِ ماجہ: حدیث نمبر:3029)۔ ابوداؤد کی ایک روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: اپنے آپ پر سختی نہ کرو، ورنہ اللہ تمہارے اوپر سختی کرے گا۔ جن لوگوں نے اپنے آپ پر سختی کی اللہ تعالیٰ نے ان پر سختی کی۔ ان کے آثار دیر اور کلیسا میں موجود ہیں۔ رہبانیت انہوں نے خود اختیار کی تھی۔ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ نہ تھی۔ (ابوداؤد: حدیث نمبر:4904)۔

ان احادیث سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شرعی معاملات میں کوتاہی اگر جرم ہے تو غلو سے بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے روکا ہے۔ تشدّد اور حد اعتدال سے ہٹی ہوئی کوششوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے

دیکھا ہے۔لوگوں کو اعتدال کی روش اختیار کرنے کی تلقین کی ہے۔لوگوں کو آسانیاں پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے: و یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ (الاعراف:157)(اوران پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جواُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے)

شرعی احکام میں کمزوروں،ضرورت مندوں محتاجوں،عورتوں،اور بچوں کو جو رعایتیں دی گئی ہیں وہ شریعت کے اسی مزاج کی عکاس ہیں کہ اس نے ضروریات اور حالات کی رعایت کرتے ہوئے بندوں کی صلاحیتوں اور قوتوں کو راہِ حق میں استعمال کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ بخاری کی وہ حدیث اسی بات کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دین آسان ہے اور جو شخص دین کے معاملہ میں شہ زوری دکھائے گا، دین اس پر غالب آجائے گا۔

کتنا مزہ ہے رب کے حضور کھڑے ہونے میں! کتنی لذت بخش ہوتی ہے آہِ سحر گاہی! جسے اس کی لذت مل جاتی ہے وہ جانتا ہے کہ' کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی'۔کس قدر خوشی ہوتی ہے رب کی رضا کے لئے بھوک پیاس برداشت کرنے کے بعد! کتنا لطف ملتا ہے اللہ کے گھر کی زیارت میں! فرد بھول جاتا ہے اس دیدار کے بعد کہ کیا چیز ہوتی ہے دنیا! ان ساری لذتوں اور کیف بخش منزلوں کا حصول عین مطلوب ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد ہے کہ جادۂ اعتدال سے ہٹ نہ جانا اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک ناپسندیدہ امر ہے کیوں کہ پچھلی قومیں اسی وجہ سے تباہ ہوئیں۔تمہاے اوپر تمہارے جسم کا بھی حق ہے،اور تمہاری آنکھوں کا بھی۔

خرچ میں توازن

شریعت نے ہمیں مالی تنظیم کے لئے ایک مستحکم نظام دیا ہے۔آمدنی کے حلال ذرائع تلاش کرنا بھی عبادت ہے۔اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام (احلّ اللہ البیع و حرّم الربوا)۔ (سورۃ البقرۃ:275)۔رزق کی فراوانی،آمدنی کی کثرت اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے مگر جس طرح حصولِ رزق میں بندۂ مومن کو حلال اور حرام کی میزان عطا کی گئی ہے اسی طرح اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے عطا کردہ مال کو کہاں اور کیسے خرچ کرے؟ کیا دولت کو کرشمۂ ذاتی سمجھ کر محض اپنے تعیّشات کے لئے خرچ کرتا جائے یا اس کی کچھ حدود ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ولا تبذّر تبذیراً انّ المبذّرین کانوا اخوان الشیاطین۔(سورۃ الاسراء:26،27)(اور فضول خرچی نہ کرو۔یقیناً فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں)۔ولا تسرفوا انّہ لا یحبّ المسرفین۔ (الانعام:141)(اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)۔مومنانہ کردار یہ

بتایا گیا کہ: والّذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالك قواما۔(سورۂ فرقان:67) (جوخرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔)مزید کہا گیا:لا تجعل یدك مغلولة الیٰ عنقك ولا تبسطها کلّ البسط فتقعد ملوما محسورا۔ (الاسراء:29) (نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ رکھواور نہ اسے بالکل ہی کھلا چھوڑ دو کہ ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔)

ان دونوں امور میں توازن سے فرد کا مزاج اور منہاج تشکیل پاتا ہے۔ان دونوں کے نتیجے میں دوسرے رویوں میں بھی اعتدال پیدا ہوتا ہے۔فرد اپنے جسم کا حق ادا کرنے والا بنتا ہے۔کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں راہِ اعتدال اختیار کرتا ہے۔ضروریاتِ زندگی اور مسائلِ حیات کے سلسلہ میں افراط وتفریط سے ہٹ کر اس کا ایک معتدل نقطۂ نظر تشکیل پاتا ہے۔دوسروں کے حقوق ادا کرتا ہے۔مگر وہ کسی کا حق ادا کرنے کے لئے دوسروں کا حق نہیں مارتا۔بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے رزق کے حرام دروازوں کی طرف اپنی نگاہیں نہیں اٹھاتا۔اپنے فکری معاملات میں اس پہلو سے وہ متوازن ہوتا ہے کہ اسے یہ معلوم کرنے کی فکر ہوتی ہے کہ اس سے کیا مطلوب ہے اور اُسے کن امور سے بچنا ہے۔جس سے فرد کی عقل وفکر میں توازن پیدا ہوتا ہے۔وہ خواب دیکھتا ہے۔مگر اس کے خواب ریت کے تودے نہیں ہوتے، بلکہ حقائق کی دنیا سے ان کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔وہ واقعات کی دنیا میں رہتا ہے۔واقعاتی دنیا کی روشنی میں مالی معاملات کے منصوبے تیار کرتا ہے۔وہ ستاروں کی دنیا کی باتیں کرتا ہے۔مگر دن میں تارے نہیں شمار کرتا۔وہ روحانیت کی منزلیں طے کرتا ہے مگر وہ زمین اور زندگی کے حقائق پر نظر رکھتا ہے۔وہ جانتا ہے کہ اس کا زجاج حریفِ سنگ کیسے بن سکتا ہے۔

فرد اور معاشرہ کے درمیان توازن:

انسانی زندگی کی گاڑی تنہا آگے نہیں بڑھ سکتی۔معاشرہ اور دوسرے افراد اس کی زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہیں۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فرد اصل ہے یا سماج؟ سماج نہ ہو تو انسان اور اس کی توانائیاں بے سود!! معاشرہ ہی فرد کی تشکیل کرتا ہے۔اسے حالات اور ماحول فراہم کرتا ہے۔اس کے اندر اقدار کی تعمیر میں معاشرہ اہم کردار کرتا ہے۔انسان نے فرد اور سماج کی مرکزیت کی تعیین میں بہت دھوکے کھائے ہیں۔سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کی انفرادیت کو اہمیت دی۔جس کے نتیجہ میں سرمایہ ومحنت کی کشمکش میں سرمایہ کا طوطی بولنے لگا۔کمزور حقداروں کے حقوق پامال ہونے لگے۔فرد کو ہر چیز کی آزادی حاصل ہوئی۔مال جمع کرنے کا حق۔آزادئ گفتار کا حق۔اور دوسری ہمہ اقسام آزادیاں قطعِ نظر اس سے کہ ان آزادیوں نے کتنے دوسرے آزاد بندوں کی آزادیوں کو پا بہ زنجیر کردیا۔اس کے مال میں غریب اور ضرورت مند کا کوئی حق نہ رہا۔اس کشمکش میں محنت نے فتح پائی تو فرد کے حقوق سلب کر لئے گئے۔اس کے فرائض کی فہرست طویل ہوگئی۔سماج اور سماجی تقاضے ہی مقصودِ حیات قرار پائے۔سماج کو حکمرانی ملی۔فرد سے انفرادی ملکیت اور اس کی انفرادی آزادی کا حق چھین لیا گیا۔

بندۂ مومن کی زندگی فرد اور سماج کی کشمکش میں اعتدال کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ دونوں ہی پہلو اس کے نزدیک اہم ہوتے ہیں۔ فرد کی انفرادی آزادی مسلّم ہے لیکن وہ سماجی جواب دہی سے بالاتر نہیں ہوتا۔ فرد کے حقوق بھی ہوتے ہیں، اس کے فرائض بھی۔ اسے انفرادی ملکیت کا حق دیا گیا ہے، لیکن اس کے مال میں اسے مارِ گنج بنے رہنے کی اجازت نہ دی گئی۔

تحریکی زندگی میں توازن:

تحریکی زندگی کیا ہے؟ اور تحریکی زندگی میں توازن کا مفہوم کیا ہے؟ تحریک دراصل کسی مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے اور مقصد کو پالینے تک اس راستے میں لگے رہنے کا نام ہے۔

اسلامی تحریک کی سرگرمیوں میں فرد کی انفرادی کوششیں اور انفرادی کامیابی کے ساتھ ساتھ اجتماعی کوششیں اور اجتماعی اہداف کا حصول زیر بحث آتا ہے۔ اسلامی تحریکی زندگی میں ایسے مشاہدات سامنے آتے ہیں جن میں فرد اور اجتماعیت کا یہ رشتہ واضح نہیں ہوتا۔ اسلامی تحریک میں فرد کا بھی ایک ہدف ہوتا ہے، اور اجتماعیت کا بھی ایک ہدف ہوتا ہے۔ فرد کا ہدف رضائے الٰہی کا حصول اور فلاحِ آخرت کے سوا کچھ نہیں۔ روزِ قیامت بندے کے اعمال اس کے کام آئیں گے۔ ہر فرد اپنے عمل کے بارے میں مسئول ہوگا۔ دوست، احباب، رشتہ دار، کوئی بھی کسی کے کام نہ آسکیں گے۔ تحریک یا تحریکی رفقاء بھی اس کے کام نہ آئیں گے۔ تحریک کا ہدف یہ ہے کہ فرد انفرادی زندگی میں کامیاب ہو، یہ صحیح ہے لیکن اجتماعی حیثیت میں تحریک کا اجتماعی ہدف فلاحِ آخرت کے حصول کے ساتھ ساتھ مادّی اہداف کا حصول ہے۔ ان دونوں اہداف کو ملحوظ رکھتے ہوئے تحریکی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ تحریک نے اگر اپنی منزل کو پالیا لیکن فرد کا رشتہ اپنے ربّ سے اتنا مضبوط نہ ہوسکا کہ روزِ آخرت اسے کامیابی مل سکے تو تحریک کی کامیابی اس کے کسی کام نہ آئے گی۔

تحریکی سرگرمیاں اور اجتماعی جدوجہد میں اگر فرد اور اجتماعیت کے اہداف کے اس فرق کو ملحوظ نہ رکھیں تو اجتماعیت کے اندر بہت سے فتنے جنم لیتے ہیں۔ تحریک کی منزل ایک ٹھوس اور محسوس چیز ہوتی ہے۔ اس منزل کو پالینے کی تمنا انسانی اور ایمانی فطرت کا تقاضا ہے، پر یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ ہماری یہ کوشش اور یہ جدّ وجہد ہمیں بحیثیت فرد کس حد تک کامیابی کی منزلوں کی طرف لے جارہی ہے۔ ہم نے اپنی جواب دہی کی کس حد تک تیاری کی ہے۔

اسلام دین وسط ہے۔ اس کی تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں۔ اس نے فرد سے جو مطالبات کئے ہیں اس میں فرد کی قوت، اور اصناف کے فرق کے ساتھ قوتوں اور صلاحیتوں کے فرق کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ایمانی اور تحریکی زندگی اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہے جب یہ افراط وتفریط سے پاک اور امت وسط کے کردار کی آئینہ دار ہو۔

میڈیا کے بڑھتے اثرات اور

مدارس کی ذمہ داریاں؟

- جدید دور میں جبکہ میڈیا کے اثرات روز بروز بڑھتے ہی جارہے ہیں، معاشرہ کا رخ متعین کرنے اور فرد کی ذہن سازی کے عمل میں اس کا کیا کردار ہے؟
- اس وقت میڈیا پر کن لوگوں کا تسلط ہے، اور وہ اس کے ذریعہ کس طرح کے مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں؟
- مدارس سے متعلق ملکی وعالمی میڈیا کا رول کیسا ہے؟ اوراہل مدارس کے درمیان میڈیا کے اس کردار کے تعلق سے کس قدر حساسیت پائی جاتی ہے؟
- اس سلسلے میں ارباب مدارس، طلبۂ مدارس اور فارغین مدارس کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جو ’’میڈیا کے بڑھتے اثرات اور مدارس کی ذمہ داریاں‘‘ سے متعلق سامنے آتے ہیں۔ ذیل کی سطور میں ان سوالات پر اچھی اور مفید گفتگو کی گئی ہے، امید کی جاتی ہے کہ اس سے ہمارے درمیان ایک سنجیدہ علمی بحث کا آغاز ہوگا۔ (مدیر)

● **قاسم سید (فلاحی)**، چیف ایڈیٹر'روزنامہ خبریں' نئی دہلی۔موبائیل نمبر:
9811199061

وقت،حالات، زمانہ کی کروٹیں اورتبدیلی کے افق سے طلوع ہوتے رجحانات بعض باتوں کو ناگزیر بنادیتے ہیں۔میڈیااس کا سب سے طاقتوراظہار ہے، چونکہ ذرائع ابلاغ جذبات،خیالات اور ردعمل کی ترسیل کااہم ترین ذریعہ ہیں اس لئے ہر دور میں اس کی کلیدی حیثیت رہی ہے۔حدتو یہ ہے کہ حکومتیں بنانے ،گرانے اور بگاڑنے میں بھی اس کا زبردست رول ہوگیا ہے۔سوشل میڈیا اس کا دوسرا روپ ہےاور یہ روپ بھی اتنا ہی دلکش ہے جتنا کہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہمارا میڈیا خودشکنی کی راہ پر چل پڑا ہےاوراپنے ناخنوں سے خود کا چہرہ نوچ رہا ہے۔آزادی احساس ذمہ داری کا تقاضا کرتی ہےاوراحساس ذمہ داری خودنگاہی اور خوداحتسابی کے بغیرممکن نہیں۔جمہوری ملک میں اظہاررائے کی آزادی کو بنیادی حق کےطور پرتسلیم کیا گیا ہے۔ہرسیاسی جماعت اس حق کے تحفظ کا عہد کرتی ہےلیکن تلخ حقیقت یہ ہے کہ آزادعدلیہ کی طرح آزاد پریس بھی کسی حکومت کے لئے آسودگی کا سبب نہیں بنتا،خواہ حکومت کتنا ہی کشادہ ذہن اور وسیع قلب کیوں نہ ہو۔اخبارات کا حلقہ محدود ہوتا ہے کیونکہ ان تک صرف ایک خواندہ ہی رسائی حاصل کرسکتا ہےلیکن ٹی وی چینلس کے لئے یہ ضروری نہیں۔ وہ کم وقت میں زیادہ لوگوں تک بات پہنچانے اوراثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔میڈیا کوکسی بات کواچھالنے سے پہلے مذہبی،تہذیبی،اوراخلاقی اقدار کی کسوٹی کے ساتھ حقائق کو پرکھنا ضابطہ کے دائرہ میں آنا چاہئےلیکن میڈیا اپنی طرف پتھر اُچھلتے دیکھ کرمشتعل ہوجاتا ہے۔وہ کسی کی بھی پگڑی اچھال سکتا ہے۔کسی کی بھی سماجی وسیاسی زندگی کوختم کرسکتا ہے۔اگرزیادتی نہ ہوتو یہ کہنے دیاجائے کہ جس طرح کوئی دہشت گرد معاشرہ کی بقاکے لئے خطرہ بن جاتا ہے،اورامن وامان پرسوالیہ نشان بن جاتا ہے، بعینہ یہی میڈیا کا رول ہے۔یہ ایسا کریکٹر ہےجس کو دیکھ کرسماجی حیثیت کا مالک خوف زدہ ہوجاتا ہےاور خودکومحفوظ رکھنے کے لئے اسے بھتہ دینے پرمجبور ہوجاتا ہے۔میڈیا کی ایک جماعت بھتہ خوروں کے جھنڈ میں بدل گئی ہے۔کردار کاقتل اس کامحبوب مشغلہ ہے۔حالانکہ اس اندھیرے میں بعض چراغ حقائق کی لَو کومفادات کی ہواؤں سےمحفوظ رکھنے کی کوشش کررہے ہیں مگراس کی جدوجہد کےٹھوس نتائج برآمد نہیں ہورہے ہیں۔بدقسمتی سے میڈیا کاایک حصہ اسNexes کا حصہ بن گیا ہےجس نے پورے سسٹم کواپنی گرفت میں لےلیا ہے۔میڈیا کے بین الاقوامی اثرات کا عالم یہ ہے کہ وہ جس کو چاہے دہشت گرد قرار دےدے اور جسے چاہے مجاہد بنادے۔طالبان وہائٹ ہاؤس کے معزز مہمان بنتے ہیں جب وہ سرخ ریچھ سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو انہیں مجاہد کہاجاتا ہے۔پھر وہی مجاہد امریکہ کوآنکھیں دکھاتے ہیں تو یہ

اصطلاح دہشت گرد میں تبدیل ہوجاتی ہے ۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سماج کے خدو خال طے کرنے میں بھی میڈیا دخیل ہوگیا ہے ۔اُس انتہائی بے لگام اور شہ زور گھوڑے کی طرح جو ہر روایت کو پاؤں تلے روندر ہا ہے ۔میڈیا ایک اور محاذ پر سرگرم ہے وہ ہے فحاشی وعریانیت ۔اس کی حد مقرر نہیں ہے ۔سب کے کپڑے اتارنے پر تلا ہے ۔وہیں معمولی سی خبر بریکنگ نیوز بن جاتی ہے ۔اوبامہ کا کتا کھوجائے تو وہ شہ سرخی ہوجاتی ہے ۔اس دھما چوکڑی میں میڈیا خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا بے اعتبار ہوگیا ہے لیکن اس کے ہمہ گیر اثرات کم نہیں ہوئے ہیں ۔

معاملہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا نہیں ہے ۔ہم ہر مرض کو اسی چشمے سے دیکھنے کے عادی ہیں ۔ جبکہ اس صورت حال کو وسیع تناظر میں دیکھا جانا چاہئے ۔اسلام اور مسلمان مظلوم ہیں اور خدا معلوم کب تک رہیں ۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ اپنے ہر مسئلے کا ذمہ دار مغرب اور میڈیا کو قرار دیتے ہیں، اس سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے ۔

ان حالات میں مدارس کی کیا ذمہ داری طے کی جائے ، وہ بے چارے پہلے ہی بہت سارے دباؤ میں جی رہے ہیں، ان کے طلبہ پر قدیم علوم کے ساتھ جدید علوم سیکھنے کا بھی دباؤ ہے ۔عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر روایت پسندی کے ساتھ روشن خیالی کا ملغوبہ تیار کرنا ہے ۔ دوسری بات یہ کہ کیا مدارس سے مراد صرف وہی مٹھی بھر مدارس ہیں جو وسائل سے لیس ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے، انہیں کسی بھی طرح کی فکر نہیں ۔داخلی و بیرونی ذرائع سے فیض یاب ہیں، یا وہ مدارس بھی اس فہرست میں شامل ہیں جنہیں روز مرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے، جو دیہات اور قصبات میں علم کا چراغ جلائے ہوئے ہیں، جو عشر اور دیگر امداد سے صبح و شام گزارتے ہیں ۔ظاہر ہے وہ مدارس یقینی طور پر اس فہرست میں شامل نہیں ہیں ۔ جہاں تک عظیم الشان مدارس کا تعلق ہے، انہوں نے میڈیا کو کبھی لائق اعتنا نہیں سمجھا ۔یہی وجہ ہے کہ وہ میڈیا کے میدان میں کچھ خاص نہیں کر سکے ۔ایسے دور میں جبکہ میڈیا دعوت و تبلیغ کا جز ولاینفک بن گیا ہے ۔مدارس نے اس سے پہلو تہی کی ہے ۔

ماضی کی غلطیوں سے سبق لینے کی اولین شرط یہ ہے کہ انہیں غلطی تسلیم کیا جائے ۔اس کے بعد اصلاح احوال کی شکل نکل سکتی ہے ورنہ غلطیوں کا جنگل گھنا ہوتا چلا جاتا ہے اور نامرادیوں کا سفر تمام ہونے میں نہیں آتا ۔مدارس پر اخبار نکالنے یا ٹی وی چلانے کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں اور نہ وہ اس کے اہل ہیں، اور نہ اس کے مکلّف، لیکن وہ افراد کے سرمائے سے جو انہیں میسر ہے بہترین لعل و گہر چن کر ان کی تربیت کر سکتے ہیں تا کہ وہ میڈیا کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دے سکیں اور اہم جگہوں پر پہنچ کر پالیسیز پر اثر انداز ہوسکیں ۔

یہ سفر وقت طلب ہے، بہت سے چیلنج درپیش ہیں۔ مختصراً یہ کہ اس دور میں دینی تعلیم کے ساتھ ماس کمیونکیشن کی تعلیم بھی ضروری ہے، یہ دین کا ایک حصہ ہے۔ بس اس کا جامہ اخلاقی اقدار کے مطابق بنانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ مدارس کے ارباب حل وعقد اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوں گے۔ ہاں یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہماری ملت کے پاس ایسڈ بہت ہے اور وہ دریا دل ہے۔ اس مد میں بھی اپنی ذمہ داری ادا کرنا باعث فخر سمجھے گی۔ سوال صرف پہلا قدم اٹھانے کا ہے۔

اللہ کا فضل و کرم ہے کہ حوصلہ شکن حالات اور نا قابل عبور چیلنجوں کے باوجود مدارس کے فارغین اپنی کوششوں سے میڈیا کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں مگران کے ہاتھ خالی ہیں۔ شاباش شاباش کہنے والی صدائیں لاتعداد ہیں لیکن اس ایوریسٹ تک پہنچنے کی جدوجہد کرنے والوں کی کمر پر ہاتھ لگانے والے خال خال ہیں۔

● **ڈاکٹر محمد ارشد فلاحی،** اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، موبائیل نمبر: 9213337177

ہندوستان میں مدارس ہمیشہ سے ایک تاریخی کردار کے حامل رہے ہیں۔ ملک میں مسلم حکومت کے قیام کے بعد مدارس ہی وہ ادارے تھے جہاں سے اُس زمانے کی حکومت کو چلانے والے کل پرزے فراہم ہوتے تھے، یعنی حکومت کی انتظامیہ، عدلیہ، اور فوجی ضرورتیں مدارس ہی پوری کرتے تھے۔ اس طرح عام سماجی زندگی میں بھی مدارس ایک فعال رول ادا کرتے تھے۔ مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مساجد کے امام، مؤذن اور مکتب کے معلم اِن ہی مدارس کے فارغین ہوا کرتے تھے۔ عدلیہ سے باہر افتاء کا کام بھی مدارس کے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کرتے تھے۔ طب، ہیئت (انجینئرنگ)، نجوم، اور فلسفے جیسے علوم بھی اِن ہی مدارس میں پڑھائے جاتے تھے۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کے زوال کے ساتھ مدارس کے نظام تعلیم میں بھی زوال آیا۔ بدلے ہوئے سیاسی حالات میں مدارس کو سول، فوج اور عدلیہ سے متعلق انتظامیہ کی فراہمی سے الگ کردیا گیا۔ نتیجے میں بڑی تعداد میں مدارس یا تو بند ہوگئے یا پھران کا دائرہ بہت ہی سمٹ گیا۔ سیاسی میدان میں شکست کے بعد ملک میں مسلمانوں کا وجود بھی خطرے میں پڑ سکتا تھا، اگر اہل مدارس آگے نہ آتے اور ملک بھر میں مدارس کا جال بچھا کر نہ صرف یہ کہ اُن کی مذہبی ضروریات نہ پوری کرتے بلکہ یہ مدارس ہی تھے جنہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے سماجی تانے بانے کو بھی بکھرنے سے بڑی حد تک بچائے رکھا۔

مدارس کا سماجی اور تاریخی کردار آج بھی باقی ہے، اور مدارس اِس کردار کو باقی رکھنے میں آج تک

اگر کامیاب رہے ہیں تو دیگر وجوہ کے ساتھ ایک بنیادی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ انہوں نے ذرائع ابلاغ کا کامیاب اور مؤثر استعمال کیا ہے۔ میری اس بات سے کچھ لوگوں کا متعجب ہونا فطری امر ہے۔ لیکن غور کیجئے کہ میڈیا یا ذریعہ ابلاغ کیا ہے؟ اپنی بات کی ترسیل کا ایک ذریعہ۔ اب ذرا ایک نظر مدارس پر ڈالئے، ان کے فارغین جمعہ کے خطبے ہوں، میلاد کی تقریبات ہوں، مذہبی مجالس ہوں یا ذکر و اذکار کی محفلیں، کیا حقیقت واقعہ نہیں ہے کہ انہوں نے ابلاغ کے ان تمام ذرائع اور اداروں کا عام مسلمانوں تک اپنی بات پہنچانے کے لیے بہترین استعمال کیا۔

بلاشبہ زمانے کی ترقیات نے ابلاغ و ترسیل کے ذرائع اور وسائل میں بھی بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ آج کا انسان اپنے ہاتھ میں موجود ایک چھوٹے سے آلے کی مدد سے نہ صرف یہ کہ دنیا جہان سے باخبر رہ سکتا ہے، بلکہ اپنی خبر بھی دوسروں تک پہنچا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ آج کی دنیا میڈیا کی دنیا ہے، میڈیا پر جن کا کنٹرول ہوگا، اُن کا ساری دنیا پر کنٹرول ہوگا۔ بڑی حد تک ان باتوں میں سچائی ہے، لیکن تمام سچائی بھی نہیں ہے۔ جدید میڈیا جس کی چکاچوند نے ہم سب کی نظروں کو خیرہ کر رکھا ہے، وہ ترسیل میں اہم کردار ضرور ادا کرتا ہے، لیکن سب کچھ اس پر منحصر نہیں ہے، رائے عامہ کی تشکیل میں مقامی اور بظاہر معمولی نظر آنے والے ابلاغ و ترسیل کے ذرائع آج بھی کلیدی اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ مدارس کو چاہئے کہ وہ جدید ذرائع ابلاغ کے حوالے سے جدید ٹکنالوجی کا نہ صرف یہ کہ استعمال کریں بلکہ اس مقصد کے لیے اپنے افراد کی تربیت بھی کریں، لیکن ساتھ ہی انہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ ذرائع ابلاغ کی جدید ٹکنالوجی اُن کے لیے اُس وقت تک بامعنی رہے گی، جب تک کہ وہ عوام سے جڑے رہیں گے، اور عوام سے جڑے رہنے اور اُن تک اپنی بات پہنچانے کے اہم ذرائع ابھی بھی اُن کے پاس مساجد کے خطبے، میلاد کی تقریبات، عوامی خطابات، مذہبی مجالس کی شکل میں ہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ جدید میڈیا کے پیچھے بھاگنے کی کوشش میں مدارس میڈیا کی اس شکل کو نہ کھو بیٹھیں، جو اُنہیں عوام سے جوڑتی بھی ہے اور اُنہیں بامعنی بھی بنائے رکھتی ہے۔

● **شمشاد حسین فلاحی**، ایڈیٹر ماہنامہ حجاب اسلامی، نئی دہلی۔ موبائیل نمبر: 9990056137

درس گاہیں خصوصاً دینی مدارس علم و حکمت کے مراکز ہیں، جہاں جس قدر زور علم دین اور حکمت دین کی تعلیم پر دیا جانا چاہئے، کچھ اتنا ہی زور اس بات پر بھی دیا جانا ضروری ہے کہ طلبہ دنیا کے حالات اور یہاں پیش آنے والے واقعات اور حوادث کے ساتھ ساتھ قوموں کی سیاسی پالیسیوں سے نہ صرف

آ گاہ رہیں، بلکہ دینی،فکری اور عملی طور پر اثر انداز ہونے کے بارے میں بھی سوچتے رہیں۔

جس طرح نصابی کتابیں علم وحکمت کے حصول کا ذریعہ ہیں، اسی طرح میڈیا یا ذرائع ابلاغ سے مضبوط تعلق حالات حاضرہ، اقوام وملل کی سیاسی، معاشی، سماجی اور اقتصادی پالیسیوں اور دنیا پر حکومت کے لیے ان کے منصوبوں اور اسٹرٹیجیز سے واقفیت لازمی ہے۔ دنیا اس وقت شدید قسم کی نظریاتی وسیاسی کشمکش سے دوچار ہے، اور جو لوگ اس کشمکش کے اسباب وعوامل سے ناواقف رہتے ہوئے جیتے ہیں، وہ کالانعام ہیں، اور کسی بھی وقت وہ اس کشمکش کی زد میں آ کر ذبح ہو سکتے ہیں، یہ بات اہل مدارس کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے۔

اس سلسلے میں مدارس کو دو سطحوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے:

ایک تو یہ کہ وہاں پر موجود طلبہ واساتذہ کو موجودہ دور کے ذرائع ابلاغ سے مستفید کرا کر عملی قیادت کے لیے درکار علم وآ گہی فراہم کی جائے، اس کے لیے سیدھے سادھے طور پر ٹی وی اور اخبارات تک براہ راست پہنچ بہت ضروری ہے۔

دوسرے فارغ ہونے والے طلبہ کے اندر اس کی ضرورت اور اہمیت کا شعور پیدا کر کے اس میدان میں آ کر اثر انداز ہونے کا شوق بیدار کیا جائے۔ جو طلبہ مستقبل میں مین اسٹریم میڈیا میں آنے کا شوق رکھتے ہوں، ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ضروری مدد، مناسب تربیت اور بھرپور مواقع فراہم کئے جائیں۔

● **صداقت حسین فلاحی قاسمی**، موبائیل نمبر:9989374953،
ای میل: sadaqat.hussain@mail.com

اس وقت جب کہ اس موضوع پر میں لکھ رہا ہوں، یادوں کے کشکول سے کچھ تصویریں سر اُٹھا اُٹھا کر جھانک رہی ہیں جن سے اس موضوع کو سمجھنے میں شاید بہت آسانی ہوگی۔

پرنٹ میڈیا اور تقریری میدان تک تو علماء کا مذہبی میدان ہے، یہاں ان کا ایک بڑا رول رہا ہے۔ مگر الیکٹرانک میڈیا کے سلسلے میں عملاً ان کا موقف ایک زمانے تک بہت واضح نہیں رہا ۲۰۰۲ء میں ہندوستان کے ایک عالمی شہرت یافتہ عالم دین (جن کا نام لینا مناسب نہیں ہے) جن کا جدید فقہی مسائل پر کوئی ثانی نہیں ہے، ان سے میں نے ایک اہم موضوع پر ETV اُردو کے لیے انٹرویو لینا چاہا تو اُن کا جواب تھا: ''کیا آپ صرف میری آواز کو ریکارڈ نہیں کر سکتے؟'' میں نے جواب میں کہا ٹیلی ویژن آڈیو ویژول میڈیم ہے۔ اس میں صرف آواز نہیں ڈالی جاسکتی تو مولانا کچھ یوں گویا ہوئے کہ ''اگر لوگ مجھے ٹیلی ویژن پر دیکھ لیں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ٹیلی ویژن دیکھنے کو حلال سمجھ بیٹھیں''۔ خدا ترسی سے بھرپور

اس بات نے مجھے لاجواب کر دیا۔
ایک دوسرا واقعہ ایک عالمی شہرت یافتہ قاری صاحب کا ہے۔ جب میں نے ان کو فون پر ہی ٹیلی ویژن پر قرأت کی دعوت دی تو اُن کا جواب تھا، ''میں اسے حرام سمجھتا ہوں اور کبھی ٹیلی ویژن پر نہیں آتا'' میں نے لاکھ سمجھایا پر وہ نہیں مانے۔ بالآخر میں نے جاننا چاہا کہ حرام ہونے کی وجہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: ''کیا آپ ٹیلی ویژن نہیں دیکھتے؟ اُس پر کیسے کیسے گندے پروگرام آتے ہیں۔ میں نے کہا: جناب میں تو ٹیلی ویژن کے لیے ہی پروگرام بناتا ہوں، اور میری دیرینہ خواہش ہے کہ آپ کی دلکش و مسحور کن آواز کروڑوں انسانوں کو اللہ کی کتاب سے متأثر کر سکے کیوں کہ ہمارا چینل ۵۰/ سے زیادہ ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ قاری صاحب اب بھی اپنے موقف پر قائم تھے۔ میں نے فون رکھتے رکھتے بڑے ادب سے کہا کہ مجھے افسوس رہے گا کہ آپ کی خوبصورت آواز میں لوگ قرآن نہیں سُن سکیں گے، اور یہ کہ ایک بار آپ اپنے موقف پر غور کریں اور کوئی گنجائش نکل آئے تو مجھے ضرور بتائیں۔ ویسے آپ کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک ایسی چیز جو کانچ، اسٹیل اور پلاسٹک جیسے مادوں کا مجموعہ ہے وہ حرام کیسے ہو سکتی ہے۔ البتہ اس میں آنے والے پروگرام حرام یا حلال ہو سکتے ہیں۔ قاری صاحب کا پھر کبھی فون نہیں آیا اور وہ آج تک اپنے اُسی موقف پر پورے اخلاص کے ساتھ ثابت قدم ہیں۔
جب عالمی شہرت کے حامل فارغین مدارس کا یہ حال ہے تو اور مدارس کا کیا حال ہوگا اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں، اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ مندرجہ بالا صاحبان اپنے اپنے مدرسے بھی چلاتے ہیں۔ خیر یہ تو دس سال پہلے کی تصویریں ہیں۔ بعد کے دس سالوں میں جب ٹیریرزم کے نام پر اسلام اور مسلمانوں کو نشانہ بنایا جانے لگا، اور مسلم نوجوانوں کے ساتھ ساتھ نوجوان علماء کی بھی گرفتاریاں شروع ہوئیں تو علماء میں الیکٹرانک میڈیا کی اہمیت کے تئیں کچھ نرم گوشے پیدا ہوئے۔ بلکہ بعض جن پر یہ آفت گزری اُن پر خوب اچھی طرح واضح ہو گیا کہ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے بار بار بولا جانے والا جھوٹ بھی بہت بڑا سچ بن جاتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی واضح ہوئی کہ ٹی وی چینل کئی طرح کے ہوتے ہیں، ضروری نہیں کہ ہر ٹی وی چینل پر فحش پروگرام ہی دکھائے اور بتائے جاتے ہوں، بلکہ ٹیلی ویژن کے ذریعے چوبیس گھنٹے آپ دنیا بھر کی خبریں، معلومات اور حالات پر نظر رکھ سکتے ہیں اور یہ چینل اگر آپ کا ہو تو آپ خود بھی اپنا پیغام گھر گھر تک پہنچا سکتے ہیں۔
میڈیا کتنی بڑی طاقت ہے اس کو بیش تر مدارس، اور دیگر علماء نے سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ کہتے ہیں جب جاگو تب سویرا۔ اب وہ علماء بھی جو کبھی تصویریں کھنچوانا حرام سمجھتے تھے ٹیلی ویژن پر مختلف موضوعات پر دنیا کے سامنے اپنا موقف واضح کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن میڈیا کی طاقت کو سمجھنے کے باوجود مدارس اور

مدارس کے باہر کے علماء اور چھوٹی بڑی اسلامی تنظیموں کی سربراہی کررہے علماء اس طاقت کو اپنی طاقت بنانے اور اسے بڑے پیمانے پر استعمال کرنے میں آج بھی بڑے سست رفتار معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ آج تک ان کی کوششوں سے ہندوستان میں ایک بھی اپنا چینل نہیں آسکا، جہاں سے کم از کم اپنے مسائل ہی وہ حکومت کے سامنے رکھ سکتے اور اپنے اوپر لگ رہے الزامات کا جواب دے پاتے، البتہ اس ضمن میں غیر علماء کا خاصہ رول رہا ہے۔ مدارس، مسلم تنظیموں اور علماء کے مستقبل کا لائحہ عمل کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اس میڈیم کو مزید سمجھیں، اُس کے مختلف شعبوں کے لیے علماء کو تیار کریں، اس شعبہ میں علماء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ملک و بیرون ملک کے بہترین اداروں میں داخل کرائیں اور ہو سکے تو مدارس میں ہی فراغت کے دوران یا فراغت کے بعد اس مضمون کی معلومات فراہم کی جائیں۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ مدرسے کا نصاب مجروح نہ ہو۔

الیکٹرانک میڈیا اور علماء دونوں کا اتنا قریبی رشتہ ہے کہ میں پندرہ سالوں سے اس میڈیم میں ہونے اور ایک فارغِ مدرسہ ہونے کی وجہ سے یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا ایک مکمل دعوت ٹریننگ پروگرام ہے جس کا موضوع ہے۔ ''پیغام ساری انسانیت تک کیسے پہنچے؟'' اس موضوع کے پہلے لفظ کو دیکھیے ''پیغام''۔ دنیا میں کس قوم کے پاس ایسا پیغام ہے جو اس بات کا حقدار ہے کہ وہ ساری دنیا تک پہنچے۔ یقیناً یہ صرف آپ کے پاس ہے اور چونکہ آپ اس میدان میں نہیں ہیں تو فحش اور شیطانی پیغام ہر گھر تک پہنچ رہا ہے۔ اور نتیجتاً شیطانوں اور فحاشی کے علمبرداروں کا ہر طرف بول بالا ہے۔ اندھیرے کا اصلاً اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا بلکہ روشنی کا نہ ہونا اندھیرے کے وجود کا سبب ہے۔ اگر ہمارا یقین ہے کہ ہمارے پاس ساری انسانیت کی فلاح و بہبود کا پیغام موجود ہے تو پھر میڈیا کے میدان میں ہمیں اترنا ہوگا۔ فحاشی اور عریانیت کے اندھیرے خود چھٹ جائیں گے۔ اب جبکہ ہمارے پاس ایک آفاقی پیغام بھی ہے اور پیغام کو پہنچانے کا ایک لامتناہی آلہ بھی۔ تو ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء مدارس کے اندر قرآن وسنت پڑھاتے وقت یہ بات نوخیز علماء کے ذہن نشین کرائیں کہ وہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں اُسے ساری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری اللہ نے ان ہی پر ڈالی ہے اور ختم نبوت کے اعلان کے بعد اب علماء ہی پیغمبروں کے جانشین ہیں (علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل) اگر اس پیغام کو ہم گھر گھر تک نہیں پہنچا سکے اور اگر کوئی ایک آدمی بھی اس پیغام سے محروم رہا تو اس کے ذمہ دار ہم علماء ہی ہوں گے، اور آج گھر گھر تک یہ پیغام پہنچانے کا سب سے بڑا ذریعہ الیکٹرانک میڈیا اور ڈیجیٹل میڈیا ہے۔ جب طلبہ اپنی حیثیت اور پیغام کی آفاقیت کو سمجھ لیں گے تو اُنہیں یہ فکر ضرور دامن گیر ہوگی کہ اس پیغام کو ہر ہر فرد تک پہنچانے کے ذرائع اور کیا کیا ہوں گے۔ پھر وہ جب آج کے ذرائع اور وسائل کو دیکھیں گے اور سمجھیں گے تو انھیں ان سے نفرت کے بجائے یہ فکر ہوگی کہ میڈیا کی تلوار کفر کے ہاتھوں سے اسلام کے ہاتھوں کب اور

کیسے آئے۔تب وہ یہ بھی سمجھ پائیں گے کہ اس کو اپنے ہاتھوں لینے میں اور جتنی دیر ہوگی آنے والے دنوں میں چیلینجز اور بڑھتے جائیں گے۔نسلوں کی نسلیں بگڑ چکی ہوں گی۔فحاشی اور عریانیت کی عادی نسلوں کے ذہن و دماغ سے فحاشی اور عریانیت کی تہہ در تہہ، پرت در پرت میل کو نکالنے میں مزید توانائی صرف کرنی ہوگی۔اس لیے جتنی جلدی ہو سکے میڈیا میں اپنی موجودگی عدل وحق کی پوری شان کے ساتھ درج کرالی جائے۔گرچہ یہ اتنا آسان بھی نہیں ہے۔اس کے لیے ہمہ جہت اور ہمہ گیر تیاریوں کا ایک طویل سفر درکار ہوگا۔پر اس سفر کے آغاز میں مزید تاخیر بہت خطرناک ہے۔اس لیے کم از کم نیوز چینل سے ہی اس کا آغاز ہو جانا چاہیے۔مگر یہ یاد رہے کہ صرف ٹی وی چینل شروع کر دینا مسئلہ کا حل نہیں ہے بلکہ یہ محض سفر کا آغاز ہوگا۔رفتہ رفتہ ہر اسٹیٹ اور ہر زبان میں اس کام کو بڑھایا جانا چاہیے تاآں کہ ہم خود اپنی نیوز ایجنسی ڈیولپ کر لیں۔جہاں سے یہ سارے چینل خبریں خرید کر اپنے چینلوں پر ڈال لیتے ہیں۔فی الحال زیادہ تر نیوز ایجنسیوں کے مالک یہود ہیں اور دنیا کا ۴۰رفیصد ریونیو میڈیا اور انٹرٹینمنٹ کا امریکہ کو جاتا ہے۔

میڈیا کی صنعت کو اعلیٰ پیمانے پر چلانے کے لیے اہل بصیرت علماء کی ایک ٹیم تیار کرنی ہوگی جو نہ صرف تکنیکی اعتبار سے ماہر ہوں، بلکہ فحش پروگراموں کے مقابلہ صالح اور موثر Content دنیا کو دے کر شر پر خیر کی فتح کے جھنڈے گاڑ سکیں۔اس میڈیا کے میدان میں باطل کی جڑیں ناقابل بیان حد تک مضبوط اور گہری ہیں۔ایسے میں پوری اُمت کی نظریں علماء کی طرف ہی اُٹھتی ہیں جو اُمت کو موقع بہ موقع ہر طرح کے خطرات و مسائل سے نجات دلاتے رہے ہیں اور ہر گام پر باطل طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں۔ایسے حالات میں جبکہ اسلام اور مسلمانوں کی نہ صرف تصویر مسخ کی جارہی ہے بلکہ میڈیا کو پروپیگنڈے کا ہتھیار بنا کر دو مسلم ممالک کے درمیان نت نئے فساد برپا کر کے اُمت مسلمہ کا قتل عام ہو رہا ہے۔اس طرح کی ہی زندہ مثال ہندوستان میں مظفر نگر، یوپی کا فساد ہے۔جہاں ایک ویڈیو دکھا کر فساد کی ایک ایسی بھیانک آگ بھڑکا دی گئی جس کے اندر ہزاروں لوگ جل بھُن گئے اور جہاں بچے ہر پل مر رہے ہیں۔

- **ممتاز عالم فلاحی**، چیف ایڈیٹر انڈیا ٹو مارو، نئی دہلی

آج میڈیا نہ صرف خبریں دیتا ہے بلکہ خبریں بناتا بھی ہے۔یہ نہ صرف رائے عامہ ہموار کرتا ہے، اور مختلف نظریات وخیالات کو فروغ دیتا ہے، بلکہ سوچنے سمجھنے اور رہنے سہنے کے انداز پر بھی اثر ڈالتا ہے۔یہ حکومت گرانے کا کام بھی کرتا ہے اور بنانے کا بھی۔یہ کسی طبقے کو رول ماڈل بنا دیتا ہے، اور کسی کو 'ویلن' بنا دیتا ہے۔ایسے میں مدارس میڈیا کو بالکل نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ مدارس کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ صحیح سمجھ بوجھ اور فکر رکھنے والے ایسے افراد کو تیار کرنا، جو سماج اور معاشرے کی تعمیر میں

مؤثر کردار ادا کرسکیں۔ ایسے وقت میں جبکہ میڈیا پوری سوسائٹی بلکہ آپ کے بیڈروم تک میں داخل ہو چکا ہے، اور لائف اسٹائل تک کو متاثر کررہا ہے، مدارس اسلامیہ جن کے مقاصد میں مثبت فکر رکھنے والے افراد کو تیار کرنا ہے، وہ اس کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ یقیناً ان کو اس کے لیے تیاری کرنی ہوگی، تاکہ وہ ایسے افراد تیار کریں اور ان کو میدان میں لائیں، جو میڈیا کے اس حملے کا مقابلہ کرسکیں۔

سوال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مدارس کیا کر سکتے ہیں؟ مدارس جن کا اصل مقصد ہے دینی تعلیم دینا، اور دین کی روح اور اس کی احکام اور معارف سے طلبہ کو باخبر کرنا، وہ ظاہر ہے میڈیا انسٹی ٹیوٹ تو نہیں کھول سکتے، بلکہ شائد وہ میڈیا کورسیس بھی نہیں چلا سکتے۔ کیونکہ جہاں ایک طرف قرآن وحدیث پڑھایا جارہا ہو، وہاں ساتھ میں میڈیا کا باضابطہ کوئی کورس شروع نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا کرنا ان کے اصل مقصد اور مشن سے ان کو موڑ دینا ہوگا، اور اس کے نتیجہ میں جو دوسرے اصل اور بنیادی اہمیت کے حامل مضامین ہیں وہ شائد نظر انداز ہو جائیں گے۔ پھر بھی مدارس کو اس سلسلے میں کچھ سوچنا ہوگا کہ کیسے اپنے اصل مقصد پر قائم رہتے ہوئے میڈیا کے بڑھتے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنے طلبہ کی ذہن سازی کریں۔ اپنے طلبہ کے اندر ایسی صلاحیتیں اور مہارتیں پیدا کریں کہ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد جو طلبہ بھی اس میدان میں دلچسپی رکھتے ہوں، وہ وہاں جا کر کچھ کرسکیں۔ البتہ فل فلیج میڈیا انسٹی ٹیوٹ شروع کرنا، یا میڈیا کورس چلانا تو شائد ان کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔

پھر راستہ کیا ہے؟ میرے خیال سے یہاں غیر نصابی سرگرمیوں پر نظر جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طریقہ کیا ہوگا؟ دینی مدارس کے ذمہ داروں کو بیٹھ کر اس سلسلے میں سوچنا چاہئے کہ مدارس کی جو غیر نصابی سرگرمیاں ہیں ان کو کیسے آرگنائز کریں کہ اس میں میڈیا سے متعلق کچھ سرگرمیوں کو داخل کیا جاسکے، جس سے طلبہ کی ذہن سازی بھی ہو، اور ارتقاء بھی۔ میرے خیال سے غیر نصابی سرگرمیوں کے اندر میڈیا کی کچھ چیزیں متعارف کرائی جاسکتی ہیں، جس میں سے کچھ چیزیں ہم اپنے حساب سے تجویز بھی کر سکتے ہیں۔۔ جامعۃ الفلاح میں ہمارے زمانہ طالب علمی میں کچھ سرگرمیاں ہوتی تھیں، اور مجھے امید ہے کہ اب بھی ہوتی ہوں گی، اور فلاح کی طرح کے دوسرے مدارس میں بھی وہ پائی جاتی ہوں گی۔ جیسے ہم لوگ وال میگزینس، اور وال پیپرس وغیرہ نکالا کرتے تھے۔ جن میں کچھ ہفتہ وار ہوتے تھے اور کچھ ماہنامے، جنہیں مسجد کے پاس دیوار پر ہم لوگ لگاتے تھے، اسی طرح سے کچھ قلمی میگزینس بھی ہم لوگ نکالا کرتے تھے۔

یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ میں فلاح میں داخل ہوا ۱۹۸۸ء میں، اور ۱۹۹۴ء میں وہاں سے فارغ ہوا۔ پانچ چھ سال کا عرصہ میں نے وہاں گزارا۔ اس درمیان میں نے وہاں نکلنے والے میگزینس دیکھے، بلکہ ایک وقت ایسا آیا کہ میں بھی ایک وال میگزین کا ایڈیٹر بنا۔ آج میں اپنی تعریف نہیں کرنا چاہتا، لیکن

آج میں جو کچھ بھی ہوں اس کا کریڈٹ صحیح معنوں میں فلاح ہی کو جاتا ہے۔ جہاں پڑھائی کے دوران میڈیا پر کچھ میگزین اور آرگن ہم لوگ نکالا کرتے تھے۔ میڈیا میں جانے کا حوصلہ مجھے وہیں سے ملا تھا۔ ہم لوگ جو لکھتے اور پڑھتے تھے، اور فلاح سے متعلق جو کچھ خبریں اپنے وال پیپرس میں دیا کرتے تھے، اسی سے ہم لوگوں میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی کہ یہ ایک اچھی چیز ہے، اس میں ہم لوگوں کو آگے آنا چاہئے۔ چنانچہ میڈیا پروفیشن اختیار کرنے کی جو بنیاد پڑی، وہ وہیں سے پڑی، گرچہ کہ ہمارے ساتھ اور بہت سے ساتھی تھے اور سب میڈیا میں نہیں آئے، لیکن مجھے جو بنیاد ملی، وہ وہیں سے ملی۔

اسی لیے اس بات پر میں مزید زور دینا چاہتا ہوں کہ وہ جو ماحول تھا، وال میگزینس اور وال پیپرس نکالنے کا، اس کو مزید فروغ ملنا چاہئے، اور اس کو ری آرگنائز کرنا چاہئے۔ اس زمانے میں ہمارے پاس بہت زیادہ وسائل نہیں تھے، لیکن اب جبکہ بیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، کافی چیزیں آچکی ہیں، نئی نئی ٹیکنک آگئی ہیں، لہٰذا اب غیر نصابی سرگرمیوں کو دوبارہ آرگنائز کرنا چاہئے، اور اس میں سے ۳۰ / یا ۴۰ / فیصد حصہ اگر میڈیا سے متعلق سرگرمیوں پر لگائیں تو یہ زیادہ اچھا ہوگا، کیونکہ یہ وقت کی ضرورت بھی ہے۔ اسی طرح مدارس کے اندر ایک چھوٹی سی میڈیا لائبریری کا ہونا بھی ضروری ہے، جہاں ضروری اشیاء فراہم کی جائیں اور شائق طلبہ کو وہاں پر استفادے کے لیے بھرپور مواقع فراہم کئے جائیں۔ مثال کے طور پر شائق طلبہ کے گروپس تشکیل دیئے جائیں، جو اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات پر نظر رکھیں، اور اہم اشوز پر خطوط لکھا کریں۔ اخبارات میں خطوط کی اپنی اہمیت ہوتی ہے، اس کے لیے طلبہ کو ٹریننگ دینے کی ضرورت ہے کہ کیسے وہ لیٹرس تیار کریں، زبان کس انداز کی ہو، بات کس طرح رکھی جائے، کہاں اور کب کیسا اسلوب اختیار کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت میڈیا کے اندر بہت ہی گندے اور فرقہ پرست عناصر کا غلبہ ہے، خواہ ٹیلی ویژن ہو، نیوز پیپرس ہوں، انٹرنیٹ ہو، یا مختلف سوشل میڈیا نیٹ ورک ہوں، کوئی بھی چیز سامنے آتی ہے تو ملک کے گندے اور فرقہ پرست عناصر اس پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے میں صحیح فکر، صحیح سوچ اور معتدل نظریات اور خیالات پیش کرنے کے لیے ہم اہل مدارس کو آگے آنا ہوگا، اور جدید دور میں میڈیا کی اہمیت کو سمجھنا ہوگا۔ (مبنی بر گفتگو)

● **ڈاکٹر ملک راشد فیصل**، سابق ایڈیٹر سنڈے انڈین، واسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی۔

ایک ایسے وقت میں جبکہ امت مسلمہ پر چوطرفہ وار ہو رہے ہیں اور میڈیا کے بڑھتے اثر ورسوخ کی بنا پر عوام وخواص کی نگاہ میں اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگڑتی جارہی ہے، مدارس کی یہ ذمہ داری بنتی ہے

کہ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔

برسوں پہلے ہندوستان میں میڈیا کے نام پر صرف دوردرشن، آل انڈیا ریڈیو، بی بی سی اور چیدہ اخبارات تھے۔لیکن آج ٹکنالوجی میں ترقی کے سبب چوبیس گھنٹے چلنے والے متعدد ٹی وی چینلس، ریڈیو چینلس، سوشل نیٹ ورکنگ ویب سائٹس اور مختلف اخبارات ہیں۔دیہی علاقوں میں بھی لوگ ڈش انٹینا کی مدد سے ہر طرح کے ٹی وی چینلوں کا لطف لیتے ہیں۔مقامی اخبارات دور دراز کے گاؤں میں بھی پہنچ جاتے ہیں۔چائے کی دوکانوں پر لوگ اخبارات پڑھتے ہوئے اور ریڈیو سنتے ہوئے نظر آتے ہیں اور خبروں اور مناظروں سے متأثر ہو کر اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔کم خواندہ یا اَن پڑھ لوگ ان خبروں سے بہت جلد متأثر ہو جاتے ہیں۔اب سب کے پاس موبائل پر انٹرنیٹ ہے جس میں تمام طرح کی خبریں اور تبصرے و تجزیئے ہوتے ہیں۔

بڑھتے ہوئے کمیونی کیشن کے اس دور میں میڈیا کو ایک بڑے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔یہاں تک کہ جنگیں بھی میڈیا کے ذریعے شروع کی جاتی ہیں اور پھر اسی کی بدولت جیتی جاتی ہیں۔ہم دنیا کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں اس میں میڈیا کا بہت بڑا رول ہوتا ہے کیونکہ ہم میڈیا میں جو کچھ دیکھتے، سنتے یا پڑھتے ہیں اسی کے مطابق اپنی رائے بناتے ہیں۔کسی بھی حکومت کے لئے میڈیا بحران کا سبب بھی بنتا ہے اور بحران کو ختم کرنے میں مدد بھی کرتا ہے۔اس کی وجہ سے شیئر مارکیٹ اوپر نیچے ہوتا ہے اور نتیجہ کے طور پر یہ ملک کی معیشت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

زیادہ دور نہ جا کر گزشتہ چند برسوں میں رونما ہونے والے دنیا کے واقعات پر نظر ڈالئے اور میڈیا کے اثرات کا جائزہ لیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پوری دنیا میڈیا کے زیر اثر آگئی ہے۔نائن الیون کے ہیبت ناک واقعے کے بعد جس طرح میڈیا میں مسلمانوں کو دہشت گرد اور انتہا پسند کہا جانے لگا اس سے اسلام اور مسلمان غیر مسلم دنیا کی نظروں میں کافی گر گئے۔معصوم اور سیدھے سادے لوگ بھی میڈیا کی یکطرفہ یلغار کے زیر اثر مسلمانوں کو اپنی تضحیک کا نشانہ بنانے لگے۔

ہندوستان میں کرپشن کے خلاف انا ہزارے اور ان کے ساتھیوں کی تحریک کو لگاتار پندرہ دنوں تک ٹی وی چینلوں نے چوبیس گھنٹے اس طرح دکھایا کہ رام لیلا میدان میں بدعنوانی کے خلاف دھرنا دینے والے لوگوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہوا۔ٹی وی چینلوں کی بدولت اس تحریک کی خبر ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔یہاں تک کہ حکومت کو بھی بات چیت کے ٹیبل پر آنا پڑا۔اسی طرح میڈیا کے ذریعے گجرات کے وزیر اعلیٰ اور بی جے پی کی طرف سے وزیر اعظم کے لئے نامزد نریند مودی کے لیے راہ ہموار کی جارہی ہے۔

مصر اور شام میں حکومت کے خلاف جب خوب احتجاج ہوئے اور سڑکوں پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہونے لگے تو وہاں فیس بک پر پابندی لگا دی گئی کیونکہ اس وقت فیس بک کمیونی کیشن کا ایک بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ غرض یہ کہ میڈیا کا استعمال اس وقت پوری دنیا میں حکومتیں اپنے مقاصد کے لئے کرتی ہیں اور اپنے موافق رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

آج کل اروند کیجر یوال اور عام آدمی پارٹی پر میڈیا میں کافی بحث ومباحثہ ہو رہے ہیں۔ لوک سبھا کے انتخابات کافی نزدیک ہیں اور ملک کی بڑی اور قد آور سیاسی جماعتیں یہ نہیں چاہتی ہیں کہ سیاسی منظر نامے پر کوئی ایسی پارٹی اپنے قدم جما پائے جس سے ان کا پورا کھیل خراب ہو جائے۔ اسی لئے میڈیا کے ذریعے عام آدمی پارٹی پر طرح طرح سے وار کئے جا رہے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مغرب کی ریشہ دوانیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ اس کے لئے مغربی ممالک میڈیا کا سہارا لے رہے ہیں۔ مسلمانوں پر مختلف طرح کے الزامات عائد کئے جا رہے ہیں۔ جیسے مسلمان قدامت پرست اور انتہا پسند ہوتے ہیں، وہ اپنی عورتوں کو حجاب میں رکھ کر ان کی آزادی چھین لیتے ہیں، جہاد کے نام پر وہ خودکش حملے کرتے ہیں اور معصوم عوام کو ہلاک کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اس پس منظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمان کیا کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو بھی میڈیا کی ضرورت اور اہمیت کو سمجھتے ہوئے اپنا میڈیا مضبوط بنانا چاہئے۔ چونکہ جس طرح کے معاملات اٹھائے جاتے ہیں انھیں قرآن وحدیث کی روشنی میں پرکھ کر صحیح جواب تیار کرنے میں مدارس اہم رول ادا کر سکتے ہیں، اس لئے مدارس کی سب سے پہلی ذمہ داری یہ بنتی ہے کہ وہ اس کا ایک شعبہ قائم کریں جسے ریسرچ ڈویژن کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے تحت علماء اور ماہرین کی ٹیم ان تمام الزامات کا جائزہ لے جو وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر عائد کئے جاتے ہیں۔ ان الزامات کو منھ توڑ جواب دینے کے لئے ملک کے غیر جانبدار سیکولر دانشوران کی مدد بھی لی جا سکتی ہے۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ہمارے پاس مختلف زبانوں میں اس سلسلے میں بہت سا مواد موجود ہے لیکن ہمارے پاس اسے عوام تک پہنچانے کے لئے کوئی مؤثر میڈیا نہیں ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مین اسٹریم میڈیا میں ہمارا ایک بھی انگریزی اور ہندی اخبار نہیں ہے اور نہ ہی کوئی ٹی وی چینل ہے۔ مختلف جماعتیں جیسے جماعت اسلامی ہند، جمعیت علمائے ہند یا جمعیت اہل حدیث اس کی اہمیت کو سمجھتی ہیں لیکن عملی طور پر اس میدان میں کوئی بھی قدم اٹھانے پر ناکام ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اس سمت ہمیں غور وفکر کر کے عملی اقدام کرنا چاہئے۔

اسلام کی تعلیمات کو عام کرنا مدارس کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے میں اگر

مدارس ناکام ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انھیں پوری دنیا میں رونما ہونے والے واقعات کی پوری جانکاری نہیں ہوتی ہے۔ وسائل اور دیگر اسباب کی کمی ہونے کی وجہ سے وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں الزامات اور خبروں کا جائزہ لینے میں ناکام رہتے ہیں۔

مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر اساتذہ اور طلبہ کے کے لئے ایسے لیکچرس کا اہتمام کریں جن کے ذریعے حالات حاضرہ کو اسلام کے اصولوں کی روشنی میں سمجھا جا سکے۔ روایتی علماء اور اسلامی اسکالرز اور دانشوران کے درمیان اس طرح ایک رابطہ قائم کیا جائے۔

اسی طرح جدید طرز کے مسلم اداروں کو بھی ایسے لیکچرس اور ورکشاپ کا اہتمام کرنا چاہئے جن میں علماء اسلامی تعلیمات کو طلبہ اور اساتذہ کے سامنے واضح کر سکیں۔

مساجد میں جمعہ کے خطبوں کو ایک موثر میڈیا کے طور پر استعمال کیا جائے۔ ان خطبوں میں اخلاقی، سماجی، سیاسی، معاشی نیز ہر طرح کے جدید موضوعات پر اظہار خیال کیا جائے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تمام طرح کے الزامات کا جواب دیا جائے۔ اس طرح جب کبھی کسی غیر مسلم بھائی سے ان خطبوں کے سامعین کا مناظرہ یا مباحثہ ہوگا تو وہ متعلقہ معاملات کو بہتر طور پر پیش کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ رمضان کے درمیان نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دوران خطبوں کا بہت مناسب استعمال کیا جا سکتا ہے۔

مدارس کے بچوں اور اساتذہ کو کمپیوٹر اور انگریزی کی تعلیم کی طرف بھی خاص توجہ دینی چاہئے۔ اس طرح وہ انٹرنیٹ کا استعمال کر کے سوشل میڈیا نیٹ ورکس کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو عام کر سکتے ہیں۔

● **دانش ریاض فلاحی**، منیجنگ ڈائرکٹر معیشت میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ، پروپرائٹر وہائٹ پیپر پبلی کیشنز، ای میل: danishreyaz@gmail.com

ممبئی سے شائع ہونے والے 75 سالہ قدیم اردو اخبار ''انقلاب'' کا سودا جب آر ایس ایس کی ترجمانی کرنے والے جاگرن گروپ سے دو سو کروڑ روپئے میں طے قرار پایا تو کسی کو حیرت نہیں ہوئی۔ غیر مصدقہ رپورٹوں کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے وزارت اعلیٰ کے امیدوار نریندر مودی کی میڈیا میں تشہیر پر جب 500 کروڑ روپئے لگائے گئے تو بھی کسی نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن جب 'انڈیا اگینسٹ کرپشن' کے بینر تلے اروند کیجریوال نے اپنی مہم شروع کی اور محض گیارہ ماہ کی مدت میں ''عام آدمی پارٹی''، بنا کر دہلی کی وزارت پر قبضہ کر لیا تو اکثر و بیشتر لوگوں کو یہ تبصرہ کرتے ہوئے سنا گیا کہ میڈیا نے اروند کیجریوال کو وزارت کی کرسی تک پہنچایا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس وقت ہر کوئی میڈیا

کے سہارے ہی اپنی تشہیر کروار ہا ہے اور لوگوں کے ذہن و دماغ پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دراصل عالمی میڈیا پر اگر یہودیوں نے قبضہ جمائے رکھا ہے تو ہندوستانی میڈیا پر برہمنوں کی گرفت بہت شدید ہے۔ کیا یہ سوال توجہ طلب نہیں کہ دنیا کی کل آبادی میں محض 0.2% حصہ داری رکھنے والے یہودی میڈیا میں 98% کی شراکت داری رکھتے ہیں۔ جبکہ لٹریچر کے 22% نوبل انعامات بھی انہوں نے ہی حاصل کئے ہیں۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ ہندوستانی آبادی میں محض 5% حصہ داری رکھنے والے برہمنوں کی ہندوستانی میڈیا میں 59% حصہ داری ہے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ہندوستانی آبادی میں عیسائیوں کی تعداد محض 2% ہے لیکن انگریزی میڈیا میں ان کی شرکت 98% ہے۔

المیہ یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی 13% مصدقہ اور (25% غیر مصدقہ) ہے لیکن میڈیا میں ہمارا وجود نہ کے برابر ہے۔ 2 فیصد کا تخمینہ لگایا بھی جاتا ہے تو وہ صرف ہندی اور اردو میڈیا کو شامل کر کے لگایا جاتا ہے جبکہ انگریزی میڈیا میں ہماری شمولیت بالکل نہیں ہے۔

آخر کیا وجوہات ہیں کہ تحریک آزادی میں ''الہلال'' و ''البلاغ'' کی اہمیت تسلیم کرنے والی امت وقت وحالات کے ساتھ صحافتی میدان میں پیچھے چلی گئی؟ حالانکہ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان میں جتنے مدارس ہیں اکثر و بیشتر مدارس شاید میڈیا کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہی اپنے ادارے کی جانب سے کوئی نہ کوئی جریدہ و رسالہ ضرور نکالتے ہیں لیکن اپنے نصاب تعلیم میں اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔

بدلتے زمانے کے ساتھ میڈیا نے سب سے زیادہ مسلمانوں کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کی ہے جس میں مدارس کو ہی سب سے زیادہ ٹارگیٹ کیا گیا ہے۔ مدارس کی شبیہ خراب کرنے کے لئے جس 'پروپیگنڈہ ٹول' کا استعمال کیا گیا ہے اس میں سب سے پہلے تو پرنٹ میڈیا کا کردار اہم رہا ہے اور بعد میں الیکٹرانک میڈیا نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ حالانکہ میڈیا میں کام کرنے والے افراد بخوبی واقف ہیں کہ میڈیا کے دروازے تمام لوگوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ اہم عہدوں پر اسلام دشمن طاقتوں کے ٹھیکیدار بیٹھے ہیں لہذا وہ اسلام دشمنوں کے فکر و خیال کی ترویج واشاعت کا کام کرتے ہیں، جن جگہوں پر سیکولر خیالات کے حاملین کا قبضہ ہے وہاں سے سیکولر خیالات کی ترویج ہوتی ہے۔

لہذا اس وقت جو بنیادی سوال زیر غور ہے وہ یہ کہ مدارس اسلامیہ ان بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح کا کردار ادا کریں؟

جس کا جواب یہ ممکن ہے کہ اولاً ہمیں نصاب تعلیم میں ایک سبجیکٹ میڈیا کا بھی رکھنا چاہئے جہاں

سے ابتدائی طور پر طلبہ وطالبات کی رہنمائی ہو کہ میڈیا کیا ہے اور وہاں کس طرح کام کیا جاتا ہے۔

ثانیاً یہ کہ چونکہ میڈیا میں مختلف زبان وادب کا رول اہم ہوتا ہے لہذا جب ہم اپنے یہاں زبان وادب پڑھا رہے ہوں تو طلبہ کو یہ باور کرائیں کہ اگر آپ محض اچھے مترجم بھی بن جاتے ہیں اور عربی، انگریزی اور فارسی کے ساتھ دوسری زبانوں میں تراجم کا رول ادا کر سکتے ہیں تو میڈیا میں آپ کے لئے بہترین مواقع ہیں۔

ثالثاً یہ کہ میڈیا میں خصوصاً الیکٹرانک میڈیا میں زبان وبیان کے ساتھ لہجہ وادائیگی کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور اسے ایک اعزازی ہنر سمجھا جاتا ہے چونکہ مدارس کے اندر تحریر وتقریر کے ساتھ مخارج کی تعلیم دی جاتی ہے جس کی وجہ سے طلبہ کے اندر بیان واظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی ہے لہذا اگر ہم یہ بتائیں کہ بنیادی تعلیم تو دی جا چکی محض آپ پریکٹس کے ذریعہ اسے مزید بہتر کر لیں تو بھی طلبہ کے اندر دلچسپی پیدا ہوگی اور وہ تھوڑی سی مشق کر کے اپنے آپ کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

میڈیا میں مارکیٹنگ اور اشتہارات کا بھی بڑا اہم رول ہوتا ہے، مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران جہاں اپنے مدارس کی تشہیر کے لئے مختلف پوسٹر، ہینڈ بل، پمفلٹ شائع کرتے ہیں وہیں انہیں چاہئے کہ وہ مختلف اخبارات میں اشتہارات بھی شائع کریں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں لوگوں کو معلومات حاصل ہوں گی، وہیں اخبارات کے مالکان وذمہ داران سے رابطہ پیدا ہوگا۔ وقتاً فوقتاً آپ اپنے فکر وخیال کی ترویج بھی بآسانی کر سکیں گے۔ اسی کے ساتھ فارغین مدارس کو چاہئے کہ وہ اشتہارات ومارکیٹنگ کی فیلڈ میں بھی اپنی قسمت آزمائیں اور روزگار کے مواقع تلاش کریں۔ اگر مدارس کے لوگ پہلے سے ہی رابطے میں رہیں گے تو فارغین مدارس کو نوکریاں بھی بآسانی مل سکتی ہیں۔

ٹکنالوجی کے بدلتے ہوئے دور میں بعض چیزیں مفت میں ہی میسر ہیں، بس تھوڑی سی محنت اور کوشش آپ کو بہتر مواقع عطا کر سکتی ہے۔ مثلاً یوٹیوب انٹرنیٹ پر موجود ہے جہاں آپ اپنی بنائی ہوئی فلمیں مفت میں اپ لوڈ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کی فلم یا ویڈیو کلپ مشہور ہو جاتی ہے تو یہ آمدنی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے چونکہ اس وقت بیشتر موبائل فون میں ویڈیو کلپ تیار کرنے کا آپشن موجود ہے اور بیشتر طلبہ موبائل فون استعمال کرتے ہیں لہذا اگر طلبہ کو ٹیکنالوجی کی بھی تعلیم دی جائے تو وہ نہ صرف جدید چیزوں سے آگاہ رہیں گے بلکہ بہتر معلومات کو اپ لوڈ بھی کر سکیں گے۔

مدارس اسلامیہ اپنے اپنے اداروں میں ہمہ وقت مختلف طرح کے پروگرام منعقد کرتے ہیں۔ ان دنوں بعض مدارس کے لوگ پروگرام کوریج کے لئے تو صحافیوں کو دعوت دیتے ہیں لیکن پروگرام کے حصہ کے طور پر انہیں مدعو نہیں کرتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جنہیں آپ نے مدعو کیا وہ منفی رپورٹنگ

کر کے چلا جاتا ہے نتیجتاً بلانے والا سبکی محسوس کرتا ہے اور بعد میں وہ کبھی رپورٹنگ کے لئے دعوت بھی نہیں دیتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ نے کبھی بہتر پروگرام بھی کیا تو اس سے عوام واقف نہیں ہو پاتے۔ لہذا جب آپ کسی ادارے کو شامل کریں گے، اس کے ذمہ داران کو مدعو کریں گے تو انہیں آپ کی کوششوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملے گا اور ممکن ہے کہ وہ کسی مقام پر آپ کے لئے مفید ثابت ہو۔

مدارس کے اساتذہ جب انشاء/گرامر پڑھا رہے ہوں تو وہ حالیہ دنوں کے اخبار (اردو، ہندی، انگریزی، عربی وغیرہ) کا سہارا لیں اور طلبہ کو کسی تازہ مضمون پر تبصرہ کرنے کے لئے کہیں، جب وہ طالب علم اپنا مضمون لے کر حاضر ہو تو اسے درست کر کے طالب علم سے کہیں کہ اسے کسی اخبار میں مراسلے کے کالم میں بھیج دے، ممکن ہے کہ پہلی ہی مرتبہ یا دو تین دفعہ کے بعد اس کی چیزیں مراسلے کے کالم میں شائع ہونے لگیں، جس سے نہ صرف طلبہ کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ میڈیا سے طالب علم کی دلچسپی بھی بڑھے گی اور آنے والے دنوں کے لئے ایک صحافی فارغ ہو کر نکلے گا۔

● **اظہر رفیقی (فلاحی)**، سب ایڈیٹر روزنامہ کشمیر عظمیٰ، ای میل: rafiqi12@gmail.com، موبائل نمبر: 08803965807

۔۔۔اور تم صحافت اختیار کرو۔۔۔ مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب دامت برکاتہم نے مجھے مخاطب کر کے انتہائی شفقت و محبت سے سمجھانے کی کوشش کی کہ 'اس وقت میدان عمل میں ہمارے پاس صحافیوں کی کمی ہے، لہٰذا جامعۃ الفلاح جیسے اداروں سے فارغ ہونے والے بعض طلبہ کو اس میدان میں رول ادا کرنے کیلئے بھی تیار رہنا چاہئے، اور مجھے امید ہے کہ تم اس میدان میں امت کے کام آسکو گے'۔

یہ غالباً 1998 کی سردیوں کے ایام تھے جب میں اور میرے ساتھی جامعۃ الفلاح میں فضیلت کا اپنا آخری کلاس لے رہے تھے، اور اسی دوران مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب دامت برکاتہم اور دیگر اساتذہ کرام ہمیں عملی میدان میں بھیجتے ہوئے دعاؤں اور نصائح کا تحفہ پیش کر رہے تھے۔

عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف جامعہ کے سخت نظام الاوقات کی پابندی سے آزاد ہونے کی خوشی اور دنیا کو مزید وسیع نظروں سے دیکھنے کا تجسس، لیکن دوسری طرف اپنے ساتھیوں سے بچھڑنے کا غم، اپنے پیارے اساتذہ کی شفقت سے محرومی کا احساس اور جامعہ کے در و دیوار کی خوشبوؤں سے ناطہ ٹوٹنے کی دبی دبی سی ٹیس۔۔۔ لیکن کیا کیا جائے۔۔۔ ہمیں تو زندگی کا درس دے کر اس بھری دنیا میں اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لئے ہی اِن اساتذہ کرام نے تیار کیا تھا، چنانچہ وہاں زیادہ رُک بھی نہیں سکتے تھے۔

جامعہ میں اپنے آخری ایام میں ساتھیوں نے رابطے میں رہنے کے لیے حسب روایت خط

وکتابت کے پتے، گھروں اور پڑوسیوں کے فون نمبرات (لینڈ لائن)، کیونکہ موبائیل ابھی اتنا عام نہیں تھا، اپنی ڈائریوں میں درج ساتھیوں اور اساتذہ کے جذبات واحساسات لئے ہم سب بچھڑ گئے، اور اپنی اپنی دنیا میں مصروف ہو گئے۔

مولانا نعیم صاحب دامت برکاتہم کے یہ الفاظ ایک شمع ہدایت بن کر ہمیشہ میری رہنمائی کرتے تھے، اور بالآخر حالات کے تھپیڑوں نے بھی مجھے مولانا کی نصیحت اور ہدایت پر عمل کرنے کیلئے آمادہ کر دیا، اور آج میں میں اپنے شفیق ومہربان اساتذہ کی دعاؤں کے طفیل صحافت کے میدان میں اپنے وطن کشمیر میں ذمہ داریاں ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

مولانا کے ارشادات کی اہمیت وافادیت اور امت مسلمہ کے مستقبل کے تئیں ان کی ضرورت دن بدن بڑھ رہی ہے۔ایک طرف جہاں امت مسلمہ عالمی سطح پر، خصوصا برصغیر ہندوپاک میں استعماری قوتوں کی سازشوں کا شکار ہے، وہیں اسلام اور امت مسلمہ کے خلاف زہر پھیلانے کیلئے میڈیا کو انڈسٹری کی شکل دے دی گئی ہے اور یہ عالمی میڈیا ہی ہے جو مسلم امت کے خلاف زہر افشانی کو اپنے فرض منصبی میں شامل کر کے اسلام اور اہل اسلام کو دبانے اور صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہے۔

اتنا ہی نہیں مغرب اور اسلام دشمن طاقتیں اپنی کھوکھلی تہذیبوں کو بھی دنیا پر تھوپنے کے لیے میڈیا کا ہی بھرپور استعمال کرتی ہے، اور اس ضمن میں مسلمانوں اور اسلام کو بدنام کے لیے کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا ہے۔

نئی نئی اصطلاحات کو ایجاد کر کے اپنے کھوکھلے پن اور ڈھکوسلی منطق کو دوسروں پر تھوپنے کی پالیسی کیلئے یہ طاقتیں دوسری مغلوب قوموں کو اور زیادہ پستی اور انحطاط میں دھکیلنے میں کوئی بھی لمحہ نہیں چوکتے ہیں۔ ننگے پن اور شرو حیا کی دھجیاں اڑائے جانے کو ان کا میڈیا گلیمر اور آرٹ کا نام دے کر پیش کر رہا ہے۔عورت کے تقدس کو پامال کر کے اسے سربازار ننگا کر کے اور اس کے بدن سے چادر اتار کر دنیا کے لیے سامان تسکین بنانے میں اسی میڈیا کا سب سے بڑا رول ہے۔ پسماندہ قوموں پر چڑھائی کرنے جیسے کہ امریکہ عراق، افغانستان میں، اور اسرائیل کے ذریعے فلسطین، فوجی حکومت کے ذریعے مصر، بشار الاسد کے ذریعے شام اور دمشق میں اپنی قہر سامانیاں روا رکھے ہوئے ہیں، وہیں دوسری کمزور قوتوں پر پر تولنے کیلئے بھی اسی طرح ''عالمی دہشت گردی'' کا ہوّا کھڑا کر کے میڈیا کو ہی استعمال میں لایا جا رہا ہے۔

دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے سلسلے میں میڈیا کا یہی سلوک رہا ہے، اور گزشتہ دو دہائیوں کے دوران مسلمانوں کے خلاف ایک طویل میڈیا جنگ چھیڑی گئی ہے۔جمہوریت بمقابلہ انتہا پسندی کے نام پر مسلمانوں کے خلاف وہ جنگ شروع کی گئی ہے جو کہ مظلومین کے بجائے

ظالموں کا ساتھ دے رہی ہے۔ چنندہ واقعات کو اچھال کر چند مسلمان ناموں کا سہارا لے کر ایک پوری قوم کو کس طرح نشانہ بنانے کا عمل جاری ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

اس میڈیا میں جہاں بغیر کسی تحقیق کے سب سے پہلے کسی بھی واقعے کے ساتھ مسلمانوں کو جوڑا جاتا ہے ایسے میں مظلوم بھی کبھی کبھی خود کو ہی قصوروار سمجھنے لگ جاتا ہے اور اپنا دفاع کرنے کے دوران ظالموں کی ہاں میں ہاں ملانے میں ہی اپنی عافیت سمجھنے لگتا ہے۔

مجھے یہ صورتحال دیکھ کر بار بار مولانا نعیم صاحب کے وہ ارشادات یاد آجاتے ہیں جو ہر وقت ذہن کو اس طرف متوجہ کرتے رہتے ہیں کہ ہمارے پاس میڈیا میں ان افراد کی ضرورت ہے جو اس پوری صورتحال کا پروفیشنل طریقے سے مقابلہ کر سکیں۔

یوں تو کئی بڑی مسلم دانشگاہوں میں شعبہ صحافت بہت فعال ہے اور ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں مسلم نوجوان صحافت کی ڈگریاں لے کر میدان عمل میں آجاتے ہیں لیکن ان کے پاس عملی طور پر میڈیا سے وابستہ رہنے کیلئے صرف وہی ادارے میسر ہیں جہاں پہلے سے ہی ایک بنی بنائی سوچ کی ترجمانی ہوتی ہے اور حالات کے تقاضوں کے مدنظر یہ مسلم نوجوان صحافی بھی کہیں نہ کہیں اسی یلغار کا حصہ بن جاتے ہیں جوان کے اداروں کی جانب سے برسہا برس سے جاری ہے۔

اس وقت ملک میں سرگرم بڑے بڑے میڈیا ادارے پروفیشنل طریقہ صحافت سے ہٹ کر ایک تجارتی انجمنوں کے طرز پر قائم ہیں اور صورتحال یہ ہے کہ اپنے بزنس کو دن بہ دن بڑھانے اور اقتصادی طور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی دوڑ میں اخلاقیات کا جنازہ نکالا جا رہا ہے۔ ایک سادہ سی خبر دیکھنے کیلئے ناظرین کے لیے 10 طرح کے فحش اشتہارات دیکھنا ضروری ہو گیا ہے، جبکہ اشتہاری انڈسٹریز اخلاقیات وتہذیب وتمدن کا کفن دفن کرنے میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت سے کام نہیں لیتی ہیں۔

ایسے میں بیرونی خطرات اور یلغار کے ساتھ ساتھ تہذیبی جارحیت کا مقابلہ کرنے کیلئے ایسے افراد کے ہاتھوں میں قلم وکاغذ کی ذمہ داری سونپی جانی لازمی ہے جو دین کا پختہ علم رکھتے ہوں اور ان کے اندر علوم اسلامی کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانے کے چیلنجز کا علم اور ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ لیکن ایسے افراد کہاں سے لائے جائیں یہ ایک بہت بڑا سوال بن کر سامنے آتا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے زیر انتظام چلائے جارہے تعلیمی اداروں میں رائج نصاب میں یا تو صرف اسلامی ومشرقی علوم ہیں یا سراسر دنیاوی علوم اور پیشہ ورانہ تعلیم کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔ اس افراط وتفریط کے دوران اب یہ اہم ذمہ داری مدارس اسلامیہ پر ہی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے نظام میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ دیگر پیشہ ورانہ کورسیز کو بھی لازما شامل کرے جس سے کہ موجودہ زمانے کے چیلنجز کا

مقابلہ کرنے کیلئے ہمہ وقت افراد تیار ہوتے رہیں۔

جامعۃ الفلاح کا یہ طرہ امتیاز رہا ہے کہ اس نے روایت سے ہٹ کر مدارس کے طرز تدریس کو ہمیشہ ہی مروجہ علوم کے ساتھ منطبق کر کے طلبہ کی ایک ایسی کھیپ تیار کی جو کہ ہر مقام پر جا کر ایک امتیازی اور نمایاں مقام پانے اور عصری سرگرمیوں میں دینی سرگرمیوں کو بھی جوڑ کر اپنی اور دوسروں کی دنیا وعقبیٰ کی فلاح کے لیے کام کرتے آئے ہیں، اور یہ جامعہ کے نظام کا ایک خاصہ ہے کہ اس نے ہمیشہ ہی طلبہ کی سوچ کو وسعت دینے کے لیے کام کیا، اورالحمداللہ اس وقت بھی کررہا ہے۔ اب جامعۃ الفلاح کو بھی اپنے نظام میں شعبہ صحافت کا باضابطہ طور سے آغاز کر کے ملت کے تئیں ایک اہم ذمہ داری نبھانی چاہئے اور دیگر اسلامی مدارس میں بھی اس کام کو شروع کرنے کے لیے ایک منظّم طریقہ سے رابطہ کا عمل شروع کرنا چاہئے۔

جامعۃ الفلاح کے تعلیمی ماحول میں ہی اس سوچ کو فروغ مل سکتا ہے کہ اس وقت امت مسلمہ کی نظریں ان مدارس کی طرف صرف پنجوقتہ امام صاحبان ومفتیان عظام کیلئے ہی نہیں اٹھتی ہیں بلکہ وہ ان ہی مدارس سے زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی کی تلاش میں ہے۔

آج تقریباً 16 ربرسوں کے بعد جب 'حیات نو' کے مدیر برادر ابوالاعلیٰ سید سبحانی نے ای میل اور فون کے ذریعے ''میڈیا کے بڑھتے اثرات اور مدارس کی ذمہ داریاں'' کے عنوان سے مضمون لکھنے کی تاکید کی تو دفعتہً مولانا نعیم الدین اصلاحی صاحب دامت برکاتہم کا وہ جملہ یاد آیا کہ اس وقت امت مسلمہ کو مدارس سے نکلے ہوئے صحافیوں کی ضرورت ہے جو دینی وعصری علوم سے لیس ہوکر اس قوم کی رہنمائی کریں اور باطل نظریات اور تہذیبوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔

● **محمد ثاقب**، نئی دہلی، ای میل: saqib_javed2@yahoo.com

میڈیا کے لفظی معنی ذریعہ کے ہوتے ہیں اور اصطلاح میں ہر وہ شئے میڈیا کہلاتی ہے جو کسی بھی طرح کی خبر سے آپ کو آشنا کرے، خواہ وہ ذریعہ جسیم ہو یا غیر جسیم، اس کا کوئی فزیکل وجود ہو یا نہ ہو۔

عام طور سے جب ہم میڈیا کا نام سنتے ہیں تو ہمارا ذہن اخبارات اور نیوز چینل کی جانب جاتا ہے جو بہت حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن آج کے موجودہ تیز رفتار وقت نے ان چیزوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ آج میڈیا کی مختلف جدید شکلیں وجود پذیر ہوگئی ہیں اور اپنی تیز رفتاری کے باعث یہ انسان کی زندگی کا اہم جز بھی بن گئی ہیں۔

تفصیل میں جانے سے پہلے آیئے ایک نظر میڈیا کی ان مختلف شکلوں پر ڈالیں جو آج ہمارے درمیان موجود ہیں، اور پوری طرح سے ہماری زندگی کو متاثر کر رہی ہیں۔ میڈیا کو براہ راست ہم دو

حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔ پرنٹ میڈیا ۲۔الکٹرانک میڈیا

پرنٹ میڈیا کے زمرہ میں اخبارات، میگزین، کتابیں وغیرہ آتی ہیں، جبکہ الکٹرانک میڈیا کے زمرے میں ایک لمبی چوڑی لسٹ ہے جس میں نیوز چینل سے لے کر انٹرنیٹ وسوشل سائٹس بھی شامل ہے۔

بہر حال ان دونوں ہی طرح کے میڈیا کا انسانی زندگی پر خاطر خواہ کنٹرول ہے۔ ہمارا سماج وہی سنتا ہے جو اسے میڈیا سناتا ہے، معاشرہ میں وہی چیزیں صحیح مانی جاتی ہیں جو میڈیا دکھاتا ہے، یہاں تک کہ حکومتیں بھی وہی ماننے پر مجبور ہوتی ہیں جو میڈیا کہتا ہے۔ اگر آپ کو ہماری باتوں کا یقین نہیں تو آپ مصر کے انقلاب کی مثال اپنے سامنے رکھیں، بات بالکل واضح ہو جائے گی۔ مصر میں جہاں ایک طرف میڈیا کے استعمال سے ایسی منتخب جمہوری حکومت تشکیل ہوتی ہے جو حکومت الٰہیہ کے قیام کا ارادہ رکھتی ہے تو دوسری طرف اسی میڈیا کے استعمال سے اُس حکومت کا انہدام ہو جاتا ہے۔ یہ سب اسی وجہ سے ممکن ہوا کیونکہ میڈیا کے ذریعہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑا گیا، ایک خاص پالیسی اور حکمت کے تحت ایک خاص قسم کی سوچ اور فکر عام کی گئی اور پھر انقلاب برپا ہوا جسے ساری دنیا نے دیکھا۔ غرض یہ کہ ہماری زندگی میں میڈیا کی اہمیت اس قدر ہے جس کا ہمیں بخوبی اندازہ بھی نہیں ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ اس کا استعمال کون کر رہا ہے اور کس طرح سے کر رہا ہے۔

جب ہم میڈیا کی اہمیت اور اس کے اثرات کو دیکھتے ہیں اور پھر اپنے علماء کرام اور فارغین وطلبہ مدارس کی شمولیت پر غور کرتے ہیں تو بڑی حد تک مایوسی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے مدارس کے فارغین وطلبہ کا ایک بڑا حصہ سوشل میڈیا سے جڑا تو ضرور ہے مگر اس کے سامنے لہو ولعب کے علاوہ کوئی خاص مقصد نہیں ہے، اور چند افراد جو اس کا صحیح استعمال کر رہے ہیں ان کی کوششیں بے ترتیب اور بے منظم ہونے کی وجہ سے بے اثر ہیں۔

آج کے اس تیز رفتار دور میں لوگوں کو کسی ایک جگہ اکٹھا کرنا اور اسلام کا پیغام سنانا آسان نہیں ہے کیونکہ آج لوگوں کے پاس وقت کی قلت ہے، لہٰذا میری سمجھ سے سب سے اچھا اور آسان طریقہ اس وقت سوشل میڈیا ہی ہے جس کے ذریعے ہم اپنی بات سارے عالم کو بتا سکتے ہیں۔ اس کام کیلئے نہ ہی زیادہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی دوسرے کام کو ٹالنے کی ضرورت ہے۔ گھر بیٹھے دعوت وتبلیغ کا کام آسانی سے کیا جاسکتا ہے، اور دین الٰہی کی روشنی سے سبھی کو روشناس کیا جاسکتا ہے۔

آج کے اس ترقی یافتہ دور میں مختلف قسم کے سوشل ویب سائٹس موجود ہیں جو نہ صرف لیپ ٹاپ اور ڈسک ٹاپ پر چلتے ہیں بلکہ موبائل پر بھی آسانی سے چلتے ہیں اور ان کے ذریعے ہم ہر وقت اپنے

دوستوں سے جڑے رہتے ہیں لہٰذا ان کے ذریعے اگر دعوت وتبلیغ کا کام کیا جائے تو زیادہ آسان اور زیادہ منفعت بخش ہوگا۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک باقاعدہ پالیسی اور منظّم طریقے سے ایک خاص مقصد کے تحت اس کا استعمال کیا جائے۔

اس کام میں فارغین مدارس کافی اہم رول ادا کر سکتے ہیں کیونکہ ان لوگوں نے مدرسے کے باہر کی دنیا خاطر خواہ دیکھی ہوئی ہے، انہیں معاشرہ کے مختلف شعبوں کا تجربہ ہے، وہ اچھی طرح سے میڈیا کے استعمال سے بھی واقف ہیں۔ اس لئے ہمارے فارغین مدارس کو چاہئے کہ وہ اپنے مادر علمی جائیں وہاں کے طلبہ اور اپنے اساتذہ کرام کو میڈیا کی اہمیت اور اس کی افادیت کے بارے میں بتائیں اور انہیں اس بات پر راضی کریں کہ اب اسلام کی دعوت وتبلیغ کا کام میڈیا کے ذریعہ بھی زور وشور سے شروع ہو۔ اور اگر ممکن ہو سکے تو طلبہ کے لئے ایک ٹریننگ پروگرام بھی منعقد کیا جائے تاکہ مدرسوں سے نکلنے والی پیڑھی ان ذرائع کا اسلام کی تبلیغ میں بآسانی استعمال کر سکے۔

اسی طرح ہمارے علماء کرام کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر اس نئے حربہ کو استعمال کریں جو دین اسلام کی اشاعت میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ نئی نسلیں کتابوں اور رسالوں کے مقابلے انٹرنیٹ، ویب سائٹ اور سوشل میڈیا کو زیادہ ترجیح دیتی ہیں تو ایسا کیوں نہ ہو کہ ہمارے علماء کرام بھی ان ذریعوں کا استعمال کریں اور اپنے مضبوط دلائل وخیالات کے ساتھ نہ صرف باطل سے نبرد آزما ہوں بلکہ اپنے مشوروں اور نصیحتوں سے نئی نسل کو صراط مستقیم کی طرف گامزن کرنے کی جدوجہد کریں۔

●●

نوٹ: (۱) آئندہ شمارے کے لیے خصوصی کالم کا موضوع ''**مدارس اسلامیہ میں ہندوستانی زبانوں کی تدریس**'' متعین کیا گیا ہے۔

(۲) اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اہل فکر ونظر اپنے افکار وخیالات اس طرح ارسال کریں کہ **۳۰/اپریل** تک ہمیں لازماً موصول ہو جائیں۔

(۳) کوشش رہے کہ تحریر جامع اور مختصر ہو، اور حیات نو کے ۲/سے ۳/ **صفحات** سے زائد نہ ہو۔

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۳)

(مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں)

ڈاکٹر محی الدین غازی، دار الشریعہ۔ متحدہ عرب امارات

اس مضمون میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا اہم اور عظیم کام کرنے والوں کی تحسین میں کچھ رقم کیا جائے کہ اتنی عظیم خدمت مختلف شخصیات کے ذریعہ جس قدر رہمت واہتمام سے انجام دی گئی، وہ محتاج بیان وستائش نہیں ہے۔

پیش نظر تحریر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کے ترجمہ کا کام بہت ضروری مگر نازک عمل ہے، اس میں غلطی کے امکانات کو کم سے کم کرتے رہنے کی مسلسل کوشش ضروری ہے، قرآن اللہ کا کلام ہے، تاہم اس کلام کا ترجمہ ایک انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں غلطیوں کا امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے، اسی لئے جو ترجمہ جتنا زیادہ مشہور ومتداول ہے اس کا بار بار گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیتے رہنا بھی اسی قدر زیادہ ضروری ہے۔ راقم کا مقصود غلطیوں کو نمایاں کرنا نہیں، بلکہ ترجموں کے تقابلی مطالعہ کی افادیت دکھانا ہے، اور ترجمہ کے عمل میں نظر ثانی اور اجتماعی کاوش کی اہمیت پر زور دینا ہے، کہ فقہی مسائل میں اجتماعی اجتہاد جس قدر ضروری ہے، اس سے زیادہ ضرورت ترجمہ قرآن میں اجتماعی مساعی کی ہے۔

تقابلی مطالعہ بڑی حد تک یہ تأثر بھی دیتا ہے کہ بیشتر مقامات پر اگر بعض مترجمین یا مفسرین سے کوئی چوک ہوئی ہے تو دوسرے مترجمین کے یہاں اس چوک کا تدارک کرلیا گیا ہے۔ اس مختصر مقالہ میں کچھ مثالوں کے ذریعہ مختلف نوعیت کی غلطیوں کی نشاندہی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس مضمون کی تیاری میں سب سے اہم حصہ عم محترم مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی حفظہ اللہ کے افادات کا ہے جنہیں تفہیم القرآن اور تدبر قرآن کے ریویو کے دوران نوٹ کرنے کا موقعہ ملا۔

(ا) **باء بمعنی عن**

قرآن مجید میں قیامت کے موقع پر آسمان کے پھٹ پڑنے کا ذکر کیا گیا ہے،اس کے لئے انفطار کا نیز انشقاق اور تشقق کا فعل استعمال کیا گیا ہے۔ انفطار اور انشقاق دونوں کا مطلب پھٹ جانا ہے۔اور اگر کسی چیز کے پھٹ جانے کے بعد اس کے اندر سے کوئی چیز ظاہر ہو تو اس پر عن لگاتے ہیں۔ جیسے زمین سے کونپل نکلتی ہے تو اس کے لئے کہتے ہیں:انفطرت الارض عن النبات اور انشقت الارض عن النبات ،یعنی زمین نے پھٹ کر پودے کو ظاہر کر دیا۔قرآن مجید میں فعل تشقق کا عن کے ساتھ استعمال اسی مفہوم کو بیان کرتا ہے،قرآن کی ایک آیت ہے:يَوْمَ تَشَقَّقُ الْأَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعاً ذَلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيرٌ۔ (ق:44)

اس دن زمین ان پر سے پھٹ جائے گی اور وہ جھٹ پٹ نکل کھڑے ہوں گے۔(فتح محمد جالندھری)

عن سے جو مذکورہ مفہوم ادا ہوتا ہے اسے کبھی باء کے ذریعہ بھی ادا کیا جاتا ہے۔ جیسے انفطرت الارض بالنبات اور انشقت الارض بالنبات۔البتہ مولانا امانت اللہ اصلاحی کے مطابق دونوں میں یہ فرق ہے کہ جس پر عن داخل ہو اس میں صرف نمودار ہونے کا مفہوم ہوتا ہے، جبکہ باء کے استعمال سے اس کے نکل کر باہر آجانے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔

لیکن لوگوں کا ذہن ایسے موقع پر عن والے مفہوم کے بجائے باء برائے سببیت کی طرف چلا جاتا ہے، یا کسی اور طرف۔

مثال(ا) فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْماً يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيباً۔ السَّمَاء مُنفَطِرٌ بِهِ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولا۔ (المزمل:17-18)

اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اُس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا،اور جس کی سختی سے آسمان پھٹا جا رہا ہوگا؟ اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر ہی رہنا ہے۔(سید مودودی)

آسمان اس کے صدمے سے پھٹ جائے گا۔(احمد رضا خان)

آسمان اس کے بوجھ سے پھٹا پڑ رہا ہے۔(امین احسن اصلاحی)

(اور) جس سے آسمان پھٹ جائے گا۔(فتح محمد جالندھری)

آسمان پھٹ جائے گا اس دن میں۔(محمود حسن)

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے آیت کا ترجمہ اس طرح کیا: آسمان پھٹ کر اس کو ظاہر کرنے والا ہے۔مطلب واضح ہے کہ آسمان پھٹے گا اور اس میں سے قیامت کے مناظر ظاہر ہو جائیں گے،جس طرح زمین میں شگاف ہوتا ہے اور پودا اس میں سے ظاہر ہو جاتا ہے۔اس مفہوم کو سمجھنے میں ذیل کی آیت بھی

مدد کرتی ہے۔ يَسْأَلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً۔ (الاعراف:187)

وہ تم سے قیامت کے باب میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ کہہ دو کہ اس کا علم تو بس میرے رب ہی کے پاس ہے وہی اس کے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ آسمان وزمین اس سے بوجھل ہیں، وہ تم پر بس اچانک ہی آدھمکے گی۔ (امین احسن اصلاحی)

مثال(۲) وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَاءُ بِالْغَمَامِ۔ (الفرقان:25)

اس آیت میں بھی باء عن کے معنی میں ہے، مگر مترجمین نے مختلف دوسری توجیہات اختیار کی ہیں:

اور جس دن کہ آسمان ایک بدلی کے ساتھ پھٹے گا۔ (امین احسن اصلاحی، یہاں باء برائے ملابست کے لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔)

اور جس دن پھٹ جائے گا آسمان بادلوں سے۔ (احمد رضا خان، یہاں باء برائے سببیت کے لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے۔)

اور اس دن آسمان پھٹ کر بادل (کی طرح دھوئیں) میں بدل جائے گا۔ (طاہر القادری، غور طلب ہے، نہ جانے کس قاعدہ کی رو سے کیا گیا۔)

اور جس دن آسمان بادل سمیت پھٹ جائے گا۔ (محمد جونا گڑھی، یہاں بھی باء برائے ملابست کے لحاظ سے ترجمہ کیا گیا ہے، جسے بعض مفسرین نے اختیار کیا ہے، لیکن مترجم کے برعکس ان کے پیش نظر یہ تھا کہ اس وقت ایک خاص بادل کی موجودگی میں آسمان پھٹے گا، نہ یہ کہ آسمان کے ساتھ ساتھ بادل بھی پھٹ جائے گا، جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے۔)

اس آیت میں باء کو عن کے معنی میں لیں گے تو ترجمہ یہ ہوگا کہ ''اور جس دن آسمان پھٹ جائے گا اور اس میں سے ایک بادل نمودار ہوگا''، سید مودودی کا ترجمہ اسی تاویل کے مطابق ہے:

آسمان کو چیرتا ہوا ایک بادل اس روز نمودار ہوگا۔

اسی طرح اشرف علی تھانوی کا بھی: اور جس روز آسمان ایک بدلی پر سے پھٹ جائے گا۔

اس مفہوم کو سمجھنے کے لئے ذیل کی آیت سے مدد لی جاسکتی ہے: هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلآئِكَةُ۔ (البقرۃ:210)

کیا لوگوں کو اس بات کا انتظار ہے کہ ان کے پاس خود اللہ تعالی ابر کے سائبانوں میں آجائے اور فرشتے بھی۔ (محمد جونا گڑھی)

زمخشری کے الفاظ میں: والمعنى: أن السماء تنفتح بغمام يخرج منها، وفي الغمام الملائكة ينزلون وفي أيديهم صحائف أعمال العباد--- وفي معناه قوله تعالى هَلْ يَنظُرُونَ

إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلآئِكَة۔ (تفسیرالکشاف: 3/275)

(۲) أحسن ما كانوا يعملون کا ترجمہ:

قرآن مجید میں کئی مقامات پر اعمال کا بدلہ دینے کی بات بڑے زور اور تاکید کے ساتھ کہی گئی ہے، اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے بعض مقامات پر قرآن مجید میں جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اسے سمجھنے میں بعض مترجمین سے غلطی ہوئی ہے۔

جزى کا فعل عربی زبان میں کسی چیز کا بدلہ دینے یا کسی کا بدل بننے اور کام آنے کے مفہوم میں آتا ہے، اس فعل کے بعد وہ چیز ذکر ہوتی ہے جسے بطور بدلے کے دیا گیا، اور وہ چیز بھی ذکر ہوتی ہے جس کا بدلہ دیا گیا۔ کبھی دونوں ساتھ ذکر ہوتے ہیں اور کبھی کسی ایک پر اکتفا کیا جاتا ہے، دونوں کے ذکر کی مثال ہے: وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيراً۔ (الانسان:12)

اور انہیں ان کے صبر کے بدلے جنت اور ریشمی لباس عطا فرمائے۔ (محمد جوناگڑھی)

فعل جزى کے استعمال کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے تمہیں بہترین بدلہ دیا، تو کہا جاتا ہے جزاك أحسن الجزاء۔ اگر کہنا ہو کہ اس نے تمہیں تمہارے عمل کا صلہ دیا تو کہا جاتا ہے جزاك بما عملت، اگر کہنا ہو کہ اس نے تمہیں تمہارے عمل کا بہترین بدلہ دیا تو کہا جاتا ہے جزاك بما عملت أحسن الجزاء۔ لیکن اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے تمہیں تمہارے بہترین عمل کا صلہ دیا تو کہا جاتا ہے جزاك بأحسن ما عملت۔

گویا اگر بہترین بدلہ کہنا ہو تو أحسن الجزاء کہیں گے، اور اگر بہترین عمل کہنا مقصود ہو تو عمل کی طرف احسن کی اضافت ہوگی، جیسے بأحسن ما كانوا يعملون۔ یہ آخری اسلوب قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان سب مقامات پر بہترین عمل کا مفہوم اختیار کیا جاتا جو جملہ کی مذکورہ ترتیب سے متبادر ہے، لیکن اس کے بجائے بہت سارے لوگوں نے بہترین بدلے کا مفہوم اختیار کیا۔

اردو تراجم سے پہلے یہ غلطی عربی تفاسیر میں ملتی ہے، بہت سارے مفسرین نے بہترین بدلے والا مفہوم اختیار کیا، لیکن اس کے لئے انہیں أحسن یا أسوأ کے بعد جزاء کو مضاف الیہ کے طور پر محذوف ماننا پڑا، ابوحیان کے الفاظ میں: وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي: أي أحسن جزاء أعمالهم۔ (البحر المحيط:8/342) حالانکہ محذوف ماننے کے اس تکلف کی چنداں ضرورت نہیں تھی، صحیح مفہوم وہی ہے جو بغیر محذوف مانے ادا ہو رہا ہے۔ مشہور قدیم مفسر ابن عطیہ غرناطی نے آیت کا مفہوم صحیح اختیار کیا مگر اس کی نحوی توجیہ کو ایک مضاف محذوف مان کر تکلف آمیز کر دیا، وہ کہتے ہیں: وفي قوله عز وجل (ولنجزينهم أحسن) حذف مضاف تقديره ثواب أحسن الذى كانوا يعملون۔ (المحرر الوجيز:5/215) حالانکہ ثواب کو مضاف کے طور پر محذوف ماننے کی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ

جزی کے اندر ثواب کا مفہوم مکمل طور پر موجود ہوتا ہے، اور جزی کے بعد اس چیز کو راست ذکر کر دیا جاتا ہے جس کا صلہ دینا مقصود ہوتا ہے۔

یہ بات بھی سامنے رہے کہ فعل جزی کے بعد کبھی اس چیز کا ذکر کیا جاتا ہے جس کی جزاء دی جاتی ہے اور اس پر کبھی بـاء لگتی ہے اور کبھی نہیں لگتی ہے، جیسے هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا بِمَا كُنتُمْ تَكْسِبُونَ۔ (یونس:52) اور هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (النمل:90) اور کبھی نفس جزاء یا جزاء میں جو چیز دی جاتی ہے اس کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن اس پر باء نہیں لگتی ہے۔ اب اگر قرآن مجید میں کہیں أحسن آیا ہے اور کہیں باء کے ساتھ بأحسن آیا ہے، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں نفس جزاء مراد نہیں ہے بلکہ وہ چیز مراد ہے جو جزاء کا سبب یا اس کا باعث ہے یعنی عمل، گویا درست ترجمہ بہترین عمل کا اجر ہوگا نہ کہ عمل کا بہترین اجر۔

مذکورہ بالا وضاحت کے بعد ذیل میں وہ آیتیں ذکر کی جاتی ہیں، جہاں بعض مترجمین نے کمزور مفہوم کو اختیار کیا۔

(۱) لِيَجْزِيَهُمُ اللّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ۔ (التوبۃ:121)

تا کہ اللہ ان کو ان کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ (امین احسن اصلاحی، یہ ترجمہ کمزور ہے)

تا کہ اللہ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے۔ (سید مودودی)

تا کہ اللہ ان کو ان کے بہترین عمل کا بدلہ دے۔ (امانت اللہ اصلاحی)

(۲) وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (العنکبوت:7)

اور ان کو ان کے عمل کا بہترین بدلہ دیں گے۔ (امین احسن اصلاحی، یہ ترجمہ کمزور ہے)

اور انہیں ان کے نیک اعمال کے بہترین بدلے دیں گے۔ (محمد جوناگڑھی، یہ ترجمہ کمزور ہے)

اور ان کو ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے۔ (فتح محمد جالندھری، یہ ترجمہ کمزور ہے)

اور ان کو ان کے بہترین عمل کا بدلہ دیں گے۔ (امانت اللہ اصلاحی)

(۳) لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا۔ (النور:38)

تا کہ خدا ان کو ان کے عملوں کا بہت اچھا بدلہ دے (فتح محمد جالندھری، یہ ترجمہ کمزور ہے)

اس ارادے سے کہ اللہ انہیں ان کے اعمال کا بہترین بدلہ دے (محمد جوناگڑھی، یہ ترجمہ کمزور ہے)

تا کہ اللہ ان کو ان کے بہترین عمل کا بدلہ دے۔ (امانت اللہ اصلاحی)

(۴) وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُواْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُواْ يَعْمَلُونَ۔ (النحل:96)

ہم ان کو جو کچھ وہ کرتے رہے اس کا بہترین اجر دیں گے۔ (امین احسن اصلاحی، یہ ترجمہ کمزور ہے)

اور ہم یقیناً صبر کرنے والوں کو ان کے اعمال سے بہتر جزا عطا کریں گے۔ (علامہ جوادی، یہ

ترجمہ کمزور ہے)
اور جن لوگوں نے صبر کیا ہم اُن کو ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے۔ (فتح محمد جالندھری، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور صبر کرنے والوں کو ہم بھلے اعمال کا بہترین بدلہ ضرور عطا فرمائیں گے۔ (محمد جونا گڑھی، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور ہم ضرور صبر سے کام لینے والوں کو اُن کے اجر اُن کے بہترین اعمال کے مطابق دیں گے۔ (سید مودودی)
ہم ان کے بہترین عمل کا اجر دیں گے۔ (امانت اللہ اصلاحی)
(۵) وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (النحل:97)
اور (آخرت میں) اُن کے اعمال کا نہایت اچھا صلہ دیں گے۔ (فتح محمد جالندھری، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور انہیں ان اعمال سے بہتر جزا دیں گے جو وہ زندگی میں انجام دے رہے تھے۔ (علامہ جوادی، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور ان کے نیک اعمال کا بہتر بدلہ بھی انہیں ضرور ضرور دیں گے۔ (محمد جونا گڑھی، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور ہم ان کے بہترین عمل کا اجر دیں گے۔ (امانت اللہ اصلاحی)
(۶) وَيَجْزِيَهُمْ أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (الزمر:35)
اور ان کو ان کے کاموں کا اس سے خوب تر صلہ دے جو انھوں نے کئے۔ (امین احسن اصلاحی، اس ترجمہ میں کاموں کو مفضل علیہ قرار دیا گیا ہے، جو کہ صحیح نہیں ہے۔)
اور ان کا اجر ان کے اعمال سے بہتر طور پر عطا کرے۔ (علامہ جوادی، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور ان کے اچھے سے اچھے کام کا بدلہ دے۔ (امانت اللہ اصلاحی)
(۷) وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَسْوَأَ الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ (فصلت:27)
اور انہیں ان کے اعمال کی بدترین سزا دیں گے۔ (علامہ جوادی، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور ہم ان کو ان کے بدترین عمل کا صلہ دیں گے۔ (امانت اللہ اصلاحی)
اور جو بدترین حرکات یہ کرتے رہے ہیں ان کا پورا پورا بدلہ انہیں دیں گے۔ (سید مودودی)
(۸) وَلَا تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (یس:54)
اور تم کو بس وہی بدلے میں ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ (امین احسن اصلاحی، یہ ترجمہ کمزور ہے)
اور تم کو بس اسی کا بدلہ ملے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ (امانت اللہ اصلاحی)

اسی سیاق میں ایک آیت پر خاص طور سے غور کرنے کی ضرورت ہے، اور وہ ہے:

(۹) لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ أَسَاؤُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى۔ (النجم: 31)

کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے برے کام کئے ہیں ان کے کئے کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھے کام کئے ہیں اچھا۔ (امین احسن اصلاحی)

تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور اُن لوگوں کو اچھی جزا سے نوازے جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے۔ (سید مودودی)

تاکہ برائی کرنے والوں کو ان کے کیے کا بدلہ دے اور نیکی کرنے والوں کو نہایت اچھا صلہ عطا فرمائے۔ (احمد رضا خان)

آپ دیکھیں گے کہ اس مقام پر عموما مترجمین نے بالحسنی کا ترجمہ اچھی جزا کا کیا ہے۔ عربی تفاسیر میں بھی یہی نہج اختیار کیا گیا ہے، لیکن آیت کا اسلوب اور الحسنی پر باء کا داخل ہونا یہ بتاتا ہے کہ بالحسنی کا مفہوم یہاں بہترین جزا کے بجائے بہترین اعمال ہے، کیونکہ جس طرح آیت کے پہلے حصہ میں بما عملوا کہا گیا ہے اسی طرح اس دوسرے حصہ میں بالحسنی کہا گیا ہے، ترجمہ یہ ہوگا: تاکہ اللہ برائی کرنے والوں کو ان کے عمل کا بدلہ دے اور اُن لوگوں کو جنہوں نے نیک رویہ اختیار کیا ہے بہترین اعمال کا بدلہ دے۔ گویا بالحسنی بماعملوا کے مقابلہ میں آیا ہے۔

اس توجیہ کو زمخشری نے دوسرے نمبر پر ذکر کیا ہے: بِمـا عَـمِلُوا بعقاب ما عملوا من السوء، وبالحُسنى بالمثوبة الحسنى وهى الجنة۔ أو بسبب ما عملوا من السوء وبسبب الأعمال الحسنى۔ (تفسير الكشاف: 4/ 425)

سوال یہ ہے کہ اس مفہوم کو چھوڑ کر دوسرا مفہوم لینے کی وجہ کیا بنی؟ دراصل لوگوں کو اشکال یہ پیدا ہوا کہ اگر یہاں صرف بہترین اعمال کے بدلے کی بات ہے تو بہترین سے کم یعنی محض اچھے اعمال کے بدلے کا ذکر رہ جاتا ہے، ابوحیان کے الفاظ میں: وهـذا التـقدير لا يسوغ، لأنه يقتضى أن أولئك يـجـزون ثـواب أحسـن أعـمالهم، وأما ثواب حسنها فمسكوت عنه، وهم يجزون ثواب الأحسـن والـحسـن، الّا ان أخرجت أحسن عن بابها من التفضيل، فيكون بمعنى حسن، فانه يسوغ ذلك۔ (البحر المحيط: 8/ 342)

لیکن یہ اشکال صحیح نہیں ہے، بات یہ ہے کہ آدمی کو اپنے بہترین اعمال کے صلہ کی زیادہ فکر ہوتی ہے، کیونکہ نجات اور کامیابی کا اصل ذریعہ تو وہی ہوتے ہیں، اسی طرح اپنے بدترین اعمال سے زیادہ ڈر لگتا ہے، کیونکہ ان کی سزا زیادہ سخت ہوتی ہے، اور ناکامی کا اصل سبب وہی بنتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ جو اللہ کا فرماں بردار بندہ ہوتا ہے وہ ہر عمل کو احسن عمل بنانا چاہتا ہے، اور ایسے بندوں کو اللہ محسنین کی

صفت سے یاد کرتا ہے۔اور جہاں تک بھرپور بدلے کی بات ہے تو وہ مفہوم لفظ جــــزی کے اندر از خود شامل ہے، کیونکہ جزی کہتے ہی ہیں بھرپور بدلہ دینے کو۔

مذکورہ آیتوں میں بہترین جزا کے بجائے بہترین عمل مراد ہے اس کی بھرپور تائید قرآن مجید کی حسب ذیل آیت سے ہوتی ہے:أُولَـئِكَ الَّـذِيـنَ نَتَـقَبَّلُ عَنْهُمْ أَحْسَنَ مَا عَمِلُوا۔ (الاحقاف:16) اس طرح کے لوگوں سے ہم اُن کے بہترین اعمال کوقبول کرتے ہیں (سید مودودی)

دراصل اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہی بات دوسرے پیرائے میں مذکورہ بالا آیتوں میں کہی گئی ہے۔

(۳) کبھی ایک بات کا تعلق دوچیزوں سے ہوتا ہے مگر ایک سے ہی سمجھ لیا جاتا ہے :

مثال: هَلْ أَدُلُّكَ عَلَى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلَى۔ (طہ:120)

اس آیت میں غور طلب امر یہ ہے کہ شجرۃ کا تعلق الخلد اور ملك دونوں سے ہے یا صرف الخلد سے۔

متعدد ترجمہ کرنے والوں نے یہ مان کے ترجمہ کیا ہے کہ شیطان نے دو چیزوں کا سراغ دینے کی پیشکش کی تھی۔ایک چیز زندگیٔ دوام کا درخت اور دوسری چیز بادشاہی کہ جس میں کبھی ضعف نہ آئے۔

(۱) کیا میں تمہیں زندگیٔ دوام کے درخت اور ایسی بادشاہی کا سراغ دوں جس پر کبھی کہنگی نہ آئے۔(امین احسن اصلاحی)

(۲) کیا میں تم کو ہمیشگی (کی خاصیت) کا درخت بتلاؤں اور ایسی بادشاہی کہ جس میں کبھی ضعف نہ آئے۔(اشرف علی تھانوی)

(۳) اے آدم میں بتاؤں تجھ کو درخت سدا زندہ رہنے کا اور باشاہی جو پرانی نہ ہو۔(محمود الحسن)

لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، جو بات قرآن مجید میں مذکور ہے وہ یہ کہ اس نے صرف ایک درخت کا سراغ دیا جس کی اس نے دو خاصیتیں بیان کیں، ایک زندگیٔ دوام اور دوسری بادشاہی جس پر کبھی کہنگی نہ آئے۔درست ترجمہ یوں ہوگا:

کیا میں تمہیں زندگیٔ دوام اور ایسی بادشاہی جس پر کبھی کہنگی نہ آئے کے درخت کا سراغ دوں۔ (امانت اللہ اصلاحی)

اس مفہوم کے حق میں بہت واضح دلیل یہ آیت ہے:فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وُورِيَ عَنْهُمَا مِن سَوْءَاتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهَاكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَـذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَن تَكُونَا مَلَكَيْنِ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِيْنَ۔ (الاعراف:20) پھر شیطان نے اُن کو بہکایا تا کہ ان کی شرمگاہیں جو ایک

دوسرے سے چھپائی گئی تھیں ان کے سامنے کھول دے اس نے ان سے کہا: ''تمہارے رب نے تمہیں جو اس درخت سے روکا ہے اس کی وجہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ کہیں تم فرشتے نہ بن جاؤ، یا تمہیں ہیشگی کی زندگی حاصل نہ ہو جائے''۔(سید مودودی)

اس آیت سے یہ واضح ہے کہ شیطان نے صرف درخت کی بات کی تھی، جس سے آدم اور حوا کو روکا گیا تھا، اور اسی کی طرف اس نے مختلف خاصیتوں کو منسوب کیا تھا۔

(۴) اتخذ کے دو مفعولوں کا ترجمہ

اتخذ کے جب دو مفعول آتے ہیں تو درحقیقت پہلا مفعول مبتدا اور دوسرا مفعول خبر کی جگہ پر ہوتا ہے۔ جیسے وَاتَّخَذَ اللّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيْلاً (النساء:125) اللہ نے ابراہیم کو دوست بنایا، نہ کہ دوست کو ابراہیم بنایا۔ اسی طرح اتَّخَذُوا الشَّيَاطِيْنَ أَوْلِيَاء۔ (الاعراف:30) الَّذِيْنَ اتَّخَذُواْ دِيْنَهُمْ لَهْواً وَلَعِباً (الاعراف:51) اتَّخَذُواْ أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ۔ (التوبۃ:31) إِنَّ قَوْمِيْ اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوراً۔(الفرقان:30)

غرض قرآن مجید میں اس کی بہت ساری مثالیں ہیں کہ فعل اتخذ کے بعد دو مفعول آئے ہیں اور ہر جگہ فاعل نے پہلے مفعول پر دوسرے مفعول کا اثر واقع کیا ہے۔ اور ہر جگہ ترجمہ کرنے والوں نے اسی کے مطابق ترجمہ بھی کیا ہے، البتہ دو مقامات پر لگتا ہے کہ یہ پہلو مترجمین اور ان سے پہلے مفسرین کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا۔ اور وہ مقامات حسب ذیل ہیں:

(۱) أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاهُ۔ (الفرقان:43)

(۲) أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَهَهُ هَوَاه۔(الجاثیۃ:23)

ان دونوں آیتوں میں الهه پہلا مفعول ہے، اور هواه دوسرا مفعول ہے، مذکورہ بالا قاعدے کی رو سے ترجمہ یہ ہوگا کہ اپنے معبود کو اپنی خواہش بنایا ہے، اور اس کی تاویل یہ ہوگی کہ اپنے معبود کو اپنی خواہش سے بنایا ہے، یا اپنا معبود اپنی خواہش کے مطابق بنایا ہے۔ لیکن لوگوں نے مذکورہ بالا قاعدے کی رعایت نہ کرتے ہوئے اس طرح ترجمہ کیا ہے:

بھلا یہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔(امین احسن اصلاحی)

اور: کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے۔(امین احسن اصلاحی)

مفہوم کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو مشرکین کا رویہ یہی تھا کہ وہ اپنی خواہش کے مطابق اپنے معبود بنایا کرتے تھے، اور اس سلسلے میں وہ دلیل و برہان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ وہ خواہش نفس کی پیروی کرتے تھے جس کے لئے قرآن میں اتباع ہوی کا ذکر ہے، لیکن خواہش نفس کو معبود بنانے کی بات قرآن مجید میں نہیں ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ دونوں مقامات پر دونوں مفعولوں میں مکانی لحاظ سے

تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، قرآن مجید میں فعل اتخذ دومفعولوں کے ساتھ پچیس سے زیادہ مقامات پر آیا ہے، اور ہر جگہ پہلے مفعول کے اوپر دوسرے مفعول کا اثر واقع ہوا ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہاں تقدیم وتاخیر مان کر مفعول اول کو مفعول ثانی مانا جائے۔

(۴) فعل تبدل

فعل تبدل کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز کو چھوڑ کر یا کسی چیز کے بدلے میں دوسری کوئی چیز لے لینا۔ جو چیز چھوڑی جاتی ہے اس پر حرف باء داخل ہوتا ہے، اور جس چیز کو لے لیا جاتا ہے وہ مفعول بہ کی صورت میں آتا ہے۔ اس کی واضح مثال ہے: وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاء السَّبِيلِ۔ (البقرة:108)

اور جو کوئی کفر لیوے بدلے ایمان کے تو وہ بہکا سیدھی راہ سے۔ (محمود الحسن) لیکن سورۃ النساء کی آیت ذیل میں متعدد مفسرین اور مترجمین اس فعل کے قواعد کی رعایت نہ کر سکے:

وَآتُواْ الْيَتَامَى أَمْوَالَهُمْ وَلاَ تَتَبَدَّلُواْ الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ۔ (النساء:2)

اس آیت کا مفہوم یہ قرار دیا گیا کہ اپنے برے مال کو دے کر یتیموں کے عمدہ مال کو مت لے لو۔

نہ (اپنے) برے مال کو (ان کے) اچھے مال سے بدلو۔ (امین احسن اصلاحی)

ان کے پاکیزہ (اور عمدہ) مال کو (اپنے ناقص اور) برے مال سے نہ بدلو۔ (فتح محمد جالندھری)

اچھے مال کو برے مال سے نہ بدل لو۔ (سید مودودی)

قواعد کے لحاظ سے صحیح ترجمہ یہ ہے:

اور حلال چیز کے بدلے ناپاک اور حرام چیز نہ لو۔ (محمد جونا گڑھی)

اور پاک مال کے بدلے ناپاک مال حاصل نہ کرو۔ (محمد حسین نجفی)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا مال تمہارے لئے طیب ہے، یتیموں کا مال تمہارے لئے خبیث ہے، تو طیب مال چھوڑ کر خبیث مال مت اختیار کرو۔ بالفاظ دیگر یتیموں کا مال مت کھاؤ۔

(۵) ضلال بعید کا ترجمہ

قرآن مجید میں ضلال بعید کا ذکر متعدد جگہ آیا ہے۔ ضلال کے معنی گمراہی اور بعید کے معنی دور کے ہوتے ہیں، یہ درست ہے، بعید ضلال کی صفت ہے یہ بھی درست ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص راستہ بھٹک جانے کے بعد صحیح راستہ سے جس قدر دور چلا جاتا ہے اسی قدر زیادہ گمراہ ہوتا جاتا ہے، گویا خود گمراہی دور یا قریب کی نہیں ہوتی ہے بلکہ گمراہ ہونے والا قریب یا دور ہوتا ہے۔ اس لئے ضلال بعید کا ترجمہ دور کی گمراہی موزوں نہیں ہے بلکہ گمراہی میں دور جا پڑنا موزوں ہے۔

مثال: فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيدًا۔ (النساء:136)

متعدد مترجمین نے ترجمہ دور کی گمراہی کا کیا ہے:
(۱) تو وہ ضرور دور کی گمراہی میں پڑا۔(احمد رضا خان)
(۲) وہ تو بہت بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔(محمد جونا گڑھی)
لیکن موزوں ترجمہ گمراہی میں دور جا پڑنا ہے:
(۱) وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔(سید مودودی)
(۲) وہ گمراہی میں دور جا پڑا۔(امانت اللہ اصلاحی)
مندرجہ ذیل مقامات پر بھی ترجمہ میں اس کی رعایت کی جائے گی:
قَدْ ضَلُّواْ ضَلاَلاً بَعِيداً۔(النساء:167)
وَمَن يُشْرِكْ بِاللّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلاَلاً بَعِيداً۔(النساء:116)
وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَن يُضِلَّهُمْ ضَلاَلاً بَعِيداً۔(النساء:60)
أُوْلَـئِكَ فِي ضَلاَلٍ بَعِيدٍ۔ (ابراہیم:3)
إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ۔(الشوری:18)
وَلَكِن كَانَ فِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ۔(ق:27)

(٦) علی أعقابهم کا ترجمه الٹے پاؤں یا پیٹھ پیچھے

عقب کا مطلب پاؤں کی ایڑی ہوتا ہے، عام طور سے اہل لغت نے اس لفظ کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ یہ لفظ کہیں مثنی اور کہیں جمع کی صورت میں قرآن مجید میں کئی مقامات پر آیا ہے، مترجمین نے بھی عام طور سے اس کا ترجمہ الٹے پاؤں کیا ہے، لیکن امین احسن اصلاحی نے اس کا ترجمہ پیٹھ پیچھے کیا ہے، جس کی عربی لغت سے کوئی تائید نہیں ملتی، پھر اس لفظ کا مثنی استعمال ہونا بھی یہی بتاتا ہے کہ یہاں پیٹھ نہیں بلکہ پاؤں کی ایڑیاں مراد ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ شاید موصوف نے اردو محاورہ کا لحاظ کیا ہے، لیکن اردو میں بھی الٹے پاؤں پھر جانا استعمال ہوتا ہے۔ پیٹھ پیچھے پھر جانا خود اردو کے لحاظ سے درست نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ترجمہ صاحب تدبر نے کسی ایک مقام پر کرنے کے بجائے کئی جگہ کیا ہے، اس لئے اسے غلطی پر محمول کرنے کے بجائے ان کی سوچی سمجھی رائے قرار دینا مناسب ہوگا، لیکن یہ رائے ہنوز دلیل کی محتاج ہے۔
مثالیں حسب ذیل ہیں:
(۱) انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَىَ عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللّهَ شَيْئاً۔ (آل عمران: 144)
تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے؟ جو پیٹھ پیچھے پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا۔(امین احسن اصلاحی)
(۲) يَرُدُّوكُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ۔ (آل عمران:149)

تو یہ تمہیں پیٹھ پیچھے لوٹا کے رہیں گے۔(امین احسن اصلاحی)
(۳) فَكُنتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ تَنكِصُونَ۔ (المؤمنون:66)
تو تم پیٹھ پیچھے بھاگتے تھے۔(امین احسن اصلاحی)
(۴) مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَى عَقِبَيْهِ۔(البقرة:143)
ان لوگوں سے جو پیٹھ پیچھے پھر جانے والے ہیں۔(امین احسن اصلاحی)
(۵) وَنُرَدُّ عَلَى أَعْقَابِنَا۔(الانعام:71)
اور ہم پیٹھ پیچھے پھینک دیے جائیں۔(امین احسن اصلاحی)
البتہ ایک مقام پر لگتا ہے موصوف نے نادانستہ طور سے عام ترجمہ کو اختیار کرلیا:
(۶) فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَى عَقِبَيْهِ۔(الانفال:48)
تو جب دونوں گروہ آمنے سامنے ہوئے تو وہ الٹے پاؤں بھاگا (مولانا امانت اللہ اصلاحی کا خیال ہے کہ الٹے پاؤں بھاگا کے بجائے الٹے پاؤں پھر گیا ہونا چاہے۔)

(۷) جملے کی موزوں ساخت

کبھی ترجمہ تو بالکل درست ہوتا ہے لیکن جملے کی ساخت کمزور ہوتی ہے یا ایک جملے کے مختلف حصوں کی ترتیب میں خلل رہ جاتا ہے۔اس کے لئے ذیل کی مثال ملاحظہ کی جاسکتی ہے:
وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۔ (مریم:31)
اس آیت میں مادمت حیا کا ترجمہ سب نے درست کیا ہے،لیکن اس کو کسی نے جملے کے شروع میں رکھ کر یہ ترجمہ کیا:
اور جب تک جیوں،اس نے مجھے نماز اور زکوۃ کی ہدایت فرمائی ہے۔(امین احسن اصلاحی)
اور جب تک زندہ ہوں مجھ کو نماز اور زکوۃ کا ارشاد فرمایا ہے۔(فتح محمد جالندھری)
اور کسی نے جملے کے آخر میں رکھ کر یہ ترجمہ کیا:
اور اس نے مجھے نماز اور زکوۃ کا حکم دیا جب تک میں (دنیا میں) زندہ رہوں۔(اشرف علی تھانوی)
اور مجھے نماز و زکوۃ کی تاکید فرمائی جب تک جیوں۔(احمد رضا خان)
دونوں ترجموں میں جب تک جیوں والا ٹکڑا الگ تھلگ ہو گیا ہے، حالانکہ جملے کی مناسب ساخت اور ترتیب یوں ہے:
اور مجھ کو حکم دیا کہ جب تک جیوں نماز اور زکوۃ پر قائم رہوں۔(امانت اللہ اصلاحی)

●▫●

اسلامی نظریہ ونصاب تعلیم اور معلم ودانش گاہ

ڈاکٹر وسیم احمد فلاحی، سابق صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، پرسٹن یونیورسٹی عجمان

کتاب الٰہی ہمارا اصل مرجع ہے تمام مہمات امور ہیں۔ بدیہی طور پر سنت اس کی شارح ہے۔ قرآن کی رو سے حصول علم کے تین ذرائع ہیں، آفاق وانفس (فصلت ۵۳:۴۱) اور ایام اللہ یعنی تاریخ (ابراہیم 14:5)۔ ان ذرائع کو اگر سامنے رکھا جائے تو نظریۂ تعلیم کی طرف بڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔ آفاق، انفس اور تاریخ کے ذریعہ ذہن کو بیدار کرنا اور انتہائی ممکن حد تک اس کی پرورش کر لے جانا یہی تعلیم کا مقصود ہے۔ یہ تینوں ذرائع مل کر کتنا وسیع کینوس دیتے ہیں، یہ ایک واضح امر ہے۔ ذرہ سے آفتاب تک ہر شئے ان تینوں ذرائع علم اور وسائل تعلیم میں سما گئی ہے۔ یہیں سے یہ بھی طے ہو جاتا ہے کہ اسلامی اور غیر اسلامی کی تقسیم کس قدر بجا یا بے جا ہے۔ علوم کی تقسیم عملی ضرورت اور اس کے پھیلاؤ کے باعث جس قدر بھی کی جائے، اگر اس کا مقصود انسانیت کی بھلائی اور بہتری ہے تو اسے غیر اسلامی قرار دینا قرآن کے مطمح نظر کے خلاف قرار پائے گا۔ یوں بھی اسلام میں اصل اہمیت محرک (نیت) کی ہے، ظاہری اعمال سے بڑھ کر۔ بنا بریں اسلامی اور غیر اسلامی کی تفریق پر نظر ثانی کرنی ہوگی، اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ ہماری تاریخ کے اولین ادوار میں آیا یہ تقسیم رائج تھی یا علم کو ایک نا قابل تجزیہ حقیقت مانا جاتا تھا، بشمول تمام شعبہ جات کے۔ ظاہر ہے اگر تمام علوم کو اسلام کے وسیع تر دائرہ میں نہیں سمجھا جاتا تو زندگی کے بے شمار میدانوں اور شعبۂ ہائے علوم میں وہ ترقیات نہ حاصل ہو پاتیں جو ہوئیں۔ قرآن کی اجتماعی روح نے ہی وہ توانائی فراہم کی تھی جس نے مؤسسین علوم پیدا کیے۔ انسانی ہاتھ جب بادبانی کشتیاں بنا کر تیار کرتا ہے تو خدا اُسے اپنی نشانیوں میں سے گردانتا ہے۔ (الرحمٰن 55:24)

فی زمانہ وہ علوم وفنون جو اسلامی علوم کے زمرے سے علیحدہ گردانے جاتے ہیں، ان کے سلسلے میں معدودے چند مسلم ماہرین غیر شعوری اور نفسیاتی طور پر بالعموم ایک تشکیک کا شکار رہتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ غالباً وہ روحانیت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر یہ دوئی ختم اور یہ ادراک عام ہو کہ یہ تمام علوم بھی اسلامی ہی ہیں تو ان علوم میں فتوحات کا عالم دوسرا ہوگا۔ روحانیت ایک توانائی ہے جو ہر مشکل امر

کے انجام دینے کے لیے ایندھن کا کام کرتی ہے۔

قصۂ آدم میں تسمیۃ الأ شیاء (البقرہ 2:53) کا جزء مزید ہماری رہنمائی کرتا ہے، اشیاء کے نام بتا لے جانے سے مقصود ہے ان کا تصور قائم کرلے جانا اور تصور قائم کرلے جانے کا مطلب ہے ان اشیاء کو اپنے مقاصد کے لیے مسخر کرلینا۔ یہی مفہوم ہے تسخیر کا (الجاثیہ 45:13)۔ یہ تسخیر بڑی حد تک بالقوۃ ہے، اور محض ایک امکان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اسے واقعہ بنانے کے لیے غایت درجہ کی ذہنی کاوش اور حریت فکر کی ضرورت ہوگی، اور اس کے لیے تعلیم ایک وسیلہ ہے اور مہمیز۔ کتاب وسنت اس تمدنی سفر میں رصدگاہیں ہیں۔ اسی لیے صلوٰۃ اور صبر سے استمداد کی ضرورت ہے (2:45-2:153)

ان زریں اصولوں کا انطباق عملی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک ضرورت ہے، اختیار سے بڑھ کر۔ اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بقول سرسید احمد خان 'اگر دین ہاتھ سے گیا تو صرف دین جائے گا دنیا رہ جائے گی، اور اگر دنیا ہاتھ سے چلی گئی تو دین بھی جائے گا اور دنیا بھی جائے گی'۔ ایمان اور عمل میں جو رشتہ ہے وہی دین اور دنیا میں ہے، وسیع تر مفہوم میں۔ تعلیم سے مقصود اسی ہمہ گیر زندگی کے لیے تمام قوائے فکر و عمل کو بیدار اور تیار کرنا ہے۔ نہ صرف سماج کے لیے ایک صالح عنصر بنانے کی خاطر بلکہ ہر ہر شعبۂ زندگی میں سیادت کے لیے تا کہ حیات قومی کا بالخصوص اور حیات انسانی کا بالعموم صحیح رخ متعین ہو سکے۔

اسی لیے تعلیم کا مقصود ہے کہ آدمی جو دماغی قوتیں لے کر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرلے، اور اس کے ذہن کی پوری پوری پرورش ہو۔ اس کے اندر ایک ملکہ اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو تا کہ اپنی استعداد کے مطابق تمدنی زندگی کے مختلف شعبوں میں حصہ لے سکے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ کوئی تمدنی نصب العین بھی ہو۔ دوٹوک الفاظ میں وہ نصب العین یہ ہے کہ اہل اسلام کو دوبارہ وہ درجہ حاصل ہو جائے جو بارہویں صدی میں علوم وفنون کے مربی ہونے کی حیثیت سے انہیں حاصل تھا۔ تا کہ وہ اس دنیا کو جنت نظیر بنا کر عملی طور پر یہ ثابت کرلے جائیں کہ آخرت کی جنت میں انہیں واقعی دلچسپی ہے، اور تا کہ وہ اپنی موجودہ 'مانگنے والوں' کی حیثیت سے ہٹ کر 'دینے والوں' کے زمرے میں داخل ہو سکیں۔ یہیں سے وہ عزت واحترام بھی ملے گا، ایک عالَم کی نگاہ میں، جو ہم کسی اور طریقے سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس مقام تک پہنچنے کے لیے خود علم کا مفہوم طے کرنا پڑے گا۔ بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علم سے مراد محض معلوم کو جان لینا ہے۔ ایسا متبادر ہوتا ہے کہ اس تصور علم پر ہم نے اجماع کرلیا ہے۔ حالانکہ قرآنی طرز فکر اس سے مختلف ہے۔ اس لیے کہ اس کا مطمح نظر 'بالغیب' ہے۔ وہ اس بات کے لیے مہمیز کرتا ہے کہ ابتکار کے ساتھ غیر معلوم تک پہنچا جائے۔ سربستہ رازوں کے انکشاف کا نام ہے علم، جس سے روح میں

اہتزاز اور فرد میں ثقہ بالذات پیدا ہو۔ قرآن کا یہی تو منہج ہے کہ چھوٹے چھوٹے حقائق سے بڑی بڑی حقیقتوں اور بالآخر حقیقۃ الحقائق تک پہنچا جائے۔ اس کے لیے صبر درکار ہوگا (الروم 40:55- العصر 103:3)۔ اس لیے کہ یہ طویل مدتی کام ہے۔ خالق نے کائنات میں کوشش کے عمل کو ضروری قرار دیا ہے اور اسباب پر پردہ رکھ چھوڑا ہے۔ وہ تمام حقائق جو بعد محنت کے حاصل ہوں انہیں اگر بلا کوشش کے مہیا کر دیا جائے تو ان کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکے گا، اور محنت کا داعیہ بھی کمزور پڑ جائے گا۔ اسی لیے نظام تعلیم اور تصور تعلیم میں کوشش کے عنصر کا بھرپور خیال ایک ضروری امر ہے۔ سب سے بڑی کوشش تفکیر ہے، تحفیظ سے بڑھ کر، اور اسی کے لیے تیار کرنا فریضہ ہے تعلیمی عمل کا۔

دوسرا مسئلہ ہے نصاب تعلیم کا، متقاضیات عصر میں اس کا درجہ بہت آگے ہے، باعث حیرت ہے کہ بہت سی وہ کتابیں جو بہت پہلے متداول تھیں وہ آج بھی داخل نصاب ہیں۔ حیرت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجدید کاری کا ادراک بھی زمانے سے موجود ہے۔ درسیات کے ایک ایک جزو کا جائزہ لینا ہوگا۔ اس کے لیے کمیٹیوں کی تشکیل اور تحدید وقت کے ساتھ آغاز کار کی ضرورت ہوگی۔ راقم الحروف کو اس ضمن میں کسی خاطر خواہ پیش رفت کا اندازہ نہیں ہے، بدقسمتی سے، البتہ اصولی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نصاب تعلیم کو حالیہ زمانے کی ضرورتوں کے عین مطابق ہونا چاہیے بلکہ اس کے اندر یہ روح ہونی چاہیے کہ وہ حالات کو صحیح رخ دے سکے، نظر ثانی کا کام ایک مسلسل عمل ہے۔ جدید دانش گاہوں میں نصاب تعلیم پر اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر ہمہ آن غور و خوض جاری رہتا ہے اور ایک ہی تعلیمی سال کے اندر ایک سے زائد بار تبدیلیاں لے آئی جاتی ہیں۔ ہمیں بھی انھیں خطوط پر کام کرنا ہوگا کہ تا کہ خاطر خواہ نتائج حاصل ہو سکیں۔ یہ یوں بھی ضروری ہے کہ وسائل اور وقت کا صحیح صحیح اور پورا پورا استعمال بھی اسی کا تقاضا کرتا ہے۔ طالب علم کی شخصیت کے ہمہ گیر ارتقاء کے لیے مزید عمومی مضامین کو داخل نصاب کرنا اور انھیں بھی اسی دقت نظر سے پڑھانا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

نظریۂ و نصاب تعلیم سے بڑھ کر کلیدی کردار معلم کا ہے۔ اسی پر منحصر ہے نظریہ اور نصاب تعلیم کی افادیت اور اس کی ترسیل۔ وہ تمدنی اہداف جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ضروری ہے کہ معلم کا بھی مقصود اور منتہائے نظر ہوں۔ اس لیے ان اہداف پر شرح صدر یا ان سے اعلی اور بہتر مقاصد پر خود گروہ معلمین کا اتفاق تعلیمی عمل کا پہلا قدم ہے۔ ضروری نہیں کہ نصب العین معین الفاظ میں قلم بند ہو۔ تعلیم دینے والوں، تعلیم کا انتظام کرنے والوں اور تعلیم دلانے والوں کے ذہن میں اس کا ہونا اور ان کے عمل سے اس کا اظہار کافی ہے۔'' (ڈاکٹر ذاکر حسین۔ تعلیمی خطبات۔ صفحہ ۳۲-۳۰)

معلم کا یہ فرض ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ طالب علم میں کون سی خداداد صلاحیت بالخصوص پائی جاتی

ہے، جواس کی شخصیت کی تشکیل کے بے شمار امکانات میں سے کسی امکان کی تکمیل واقعتاً بن سکتی ہے۔ معلمین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ طالب علم کو موضوع تدریس سے قریب تر لے جائیں۔ کتاب کے ماوراء اور مواد تدریس کی خارج کی عملی زندگی سے تطبیق کر کے دکھائیں۔ تاکہ نظریہ اور عمل کے درمیان فاصلہ کم ہو اور اسلام کی حقیقی روح، جس کا اظہار ابھی باقی ہے، اس کا راستہ آسان ہو سکے۔ مواد تدریس کی یہ تطبیقیت زندگی کے تمام شعبوں کی جزئیات سے واضح کی جانی چاہیے، تاکہ طالب علم بآسانی سمجھ سکے اور تفکیر و تعمیل میں آسانی ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی فریضہ ہے معلم کا کہ وہ تجربات زندگی کا نچوڑ پیش کرے اور طلبہ کو یہ باور کرائے کہ ہر نسل کو اپنے مسائل خود حل کرنے ہوں گے۔ یہ اگر نہیں ہوا تو ترقی کا عمل مسدود ہو جائے گا، جیسا کہ درحقیقت ہوا ہے۔

اس سلسلے کی آخری کڑی خود دانش گاہ ہے۔ دانش گاہیں بقول ذاکر حسین ''ذہنی اور اخلاقی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں۔ اور ذہنی اور اخلاقی زندگی آزادی ہی میں پھلتی پھولتی ہے، نہیں آزادی اس کے لیے شرط حیات ہے۔ آزادی کے بغیر کوئی دانش گاہ نہ تمدنی سرمایہ کو نئی نسلوں تک صحیح طور پہنچانے کا کام کر سکتی ہے نہ اس کی صحت مند تنقید و تطہیر کا، نہ جہالت اور توہمات اور تعصّبات کے لشکروں کو پسپا کر کے علم و دانش، اخلاق حسنہ اور حیات صالحہ کے گڑھ سر کر سکتی ہے۔ نہ اچھی سیرت کی تعمیر کا کام کر سکتی ہے۔ نہ اسے شخصیت کے مقام بلند تک پہنچانے کا''۔ (صفحہ ۱۹۷-۱۹۶) تلاش حق کا پودا ایک آزادانہ فضا میں ہی پنپ سکتا ہے۔

دانش گاہیں ایک چھوٹی سی تجربہ گاہ ہوتی ہیں وسیع تر سماج کے لیے، تربیت گاہ ہوتی ہیں خارج کی عملی زندگی کے لیے، یہیں ہر طالب علم صحت مند تعامل اور بقائے باہم کے اصول سیکھتا اور برتتا ہے، ایک محدود پیمانے پر، تاکہ باہر کی دنیا میں وہ اجنبی نہ لگے۔ یہیں اس کی شناسائی سماج کے تمام صحت مند رنگوں سے ہو جاتی اور کرادی جاتی ہے، جنھیں چہار دیواری سے باہر دیکھ کر وہ ٹھٹھک نہ جائے۔ یہ ضروری ہے وسیع تر انسجام کے لیے، اگر یہ ہمارا مقصود ہے۔ مختلف ادیان و ثقافات کے ساتھ ابلاغ شروع ہوگا تو یہیں سے ورنہ شاید تا حینِ حیات نہ ہو پائے۔ تجربہ اسی پر شاہد ہے۔ البتہ یہاں شائد ایک خوف کی نفسیات کارفرما ہے۔ ذہن کے کسی گوشے میں ایک خدشہ ہے مختلف ثقافتوں اور عقائد کے افراد کے ساتھ شریک ہونے میں، خود اپنی ثقافت اور عقائد کے محو ہونے کا، اگر ایسا ہے تو یہ اسلام کا صحت مند تصور نہیں ہے، اسے بہت کمزور خیال کیا جا رہا ہے۔ بظاہر جس قوت کا اظہار کیا جاتا ہے یہ خدشہ اس کی نفی کرتا ہے۔ اسلام جس کے عقائد اور بنیادیں کائناتی سچائی پر مبنی ہیں اس کے حاملین کو اس منفی اور خوف زدہ نفسیات سے باہر نکلنا ہوگا۔ وسیع تر مقاصد کے حصول کے لیے طلبہ میں بہتر مسابقت کا جذبہ بھی یہیں سے پروان چڑھے گا۔ یہیں سے وہ پورے وطن کو اپنی جولانگاہ سمجھیں گے۔ **(بقیہ صفحہ ۱۳/ پر)**

فلسطینی بچوں کی موجودہ صورتحال

ایک تجزیاتی رپورٹ

فہیم احمد فلاحی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ارض فلسطین کے عوام عرصہ دراز سے متعدد مسائل سے دوچار چلے آرہے ہیں۔ اسرائیلی استعماریت کی جانب سے حقوق انسانی اور بالخصوص بچوں کے حقوق سے متعلق متعدد جرائم کا یہاں کھلے عام ارتکاب ہوتا رہا ہے۔ تعلیم اور صحت کے میدان میں ان بچوں کے سلسلے میں حد درجہ بے توجہی بلکہ ظلم کا رویہ برتا گیا ہے۔ متعدد خارجی اور داخلی عوامل ان کی ذہنی اور جسمانی ترقی کی راہ میں ہمیشہ حائل رہے ہیں۔ جس کا اذیت ناک نتیجہ یہ ہوا کہ ان پھول صفت نونہالوں کی نشو ونما اس انداز سے نہ ہوسکی جیسا کہ ہونی چاہیے تھی۔ لیکن بعد کے ادوار میں عالمی سطح پر اس کے خلاف آواز اٹھانے پر اقوام متحدہ اور دوسری حقوق انسانی کی عالمی تنظیموں نے اس بابت بہت سے مثبت اقدامات کئے، اور ان بچوں کے حقوق کی بازیافت پر بھی زور دیا، تا کہ ان کی ہر ممکن ضرورت کو پورا کیا جاسکے اور ان کی حالت کو بہتر سے بہتر بنایا جاسکے۔

دنیا کے تقریباً سبھی ممالک حقوق اطفال کے تحفظ کی بات کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دینے کے لیے ان ممالک کے پالیسی ساز ادارے مختلف طرح کی اسکیمیں اور پروگرامس ترتیب دیتے ہیں اور ان کے عملی نفاذ کے لیے ایک مدت کار بھی متعین کرتے ہیں، اور پھر اس مدت میں کیا کچھ اقدامات کیے گیے اس کی ایک رپورٹ ہر سال شائع بھی کی جاتی ہے۔ فلسطین کا ''مرکزی شعبۂ اعداد وشمار'' بھی یہ ذمہ داری بخوبی انجام دے رہا ہے، اور اس کے لیے اس نے ایک ایسا سازگار ماحول بنایا ہے جس میں وہ بچوں کی موجودہ تعلیم اور صحت سے متعلق صورت حال کو ان حکام، پالیسی ساز اداروں، اور دیگر جماعتوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو بچوں کے حقوق کا دفاع کرتے ہیں اور ان کی پائیدار اور جامع ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہ شعبہ اپنی اس رپورٹ کے ذریعہ انہیں یہ باور کراتا ہے کہ وہ اپنے وعدوں کو عملی جامہ پہنانے میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں، اور مزید کیا کچھ کیا جانا باقی ہے۔ اس

سلسلے میں فلسطین کے ''مرکزی شعبۂ اعداد وشمار'' نے ۲۰۱۳ء میں اپنی سولہویں سالانہ رپورٹ پیش کی جس سے متعدد حقائق سامنے آئے، جن میں سے کچھ اہم نکات حسب ذیل ہیں:

اعداد وشمار کے مطابق فلسطین کی مجموعی آبادی تقریباً ۴۳ ر لاکھ ہے۔ جس میں سے ۲۰ ر لاکھ ۴۰ ر ہزار لوگوں کی عمر ۱۸ ر سال سے کم ہے یعنی فلسطین کی آبادی کا 47.44 فیصد حصہ ۱۸ ر سال سے کم عمر افراد پر مشتمل ہے۔ چنانچہ یہ اعداد وشمار ہمیں بتاتے ہیں کہ آنے والے چند سالوں میں یہاں کی آبادی کی اکثریت نوجوان نسل پر مشتمل ہوگی۔

۲۰۱۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق 1.5 فیصد بچے معذور ہیں جس میں سے 1.8 فیصد لڑکے ہیں اور 1.3 فیصد لڑکیاں۔ ان معذور بچوں میں 29.6 فیصد بچے پیدائشی طور پر معذور ہیں جبکہ 24 ر فیصد بچے کسی نہ کسی بیماری کی وجہ سے معذور ہو گئے ہیں۔ وزارت صحت کے ۲۰۱۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق ویسٹ بینک (مغربی کنارہ) میں ایک سال سے کم عمر کے بچوں کی وفات کی سب سے اہم وجہ سانس لینے میں دشواری ہے، جس کی وجہ سے تقریباً 39.7 فیصد بچے جاں بحق ہو گئے۔ مزید برآں 16.21 فیصد بچوں کی موت نامکمل پیدائش یا کم وزن کی وجہ سے ہوئی۔ جبکہ 15.9 فیصد بچے پیدائشی طور پر جسمانی ساخت کے نقص کی وجہ سے لقمۂ اجل بن گئے۔ دوسری طرف 15.3 فیصد بچوں کی موت خون میں زہر کا اثر سرایت کر جانے کی وجہ سے ہوئی۔

جہاں تک فطری طریقے پر رضاعت کا تعلق ہے تو فلسطین میں اس کی شرح حیرت انگیز طور پر بہتر پائی گئی ہے۔ چنانچہ اس کی مدت یہاں پر اوسطاً ۱۳ ر مہینے رہی ہے۔ جبکہ 62.8 ر فیصد بچے ولادت کے ایک گھنٹے کے اندر اندر شیر خواری شروع کر دیتے ہیں۔

۲۰۰۵ء سے ۲۰۱۰ء کے درمیان ایک سال سے کم عمر میں فوت ہونے والے بچوں کی شرح ۱۰۰۰ ر میں 18.9 ہے۔ جبکہ ۵ ر سال سے کم عمر کے بچوں میں شرح اموات 23.4 ہے۔ ۶ ر سے ۵۹ ر مہینوں کے بیچ کے بچوں میں سے 19.4 فیصد بچے انیمیا (خون کی کمی) کا شکار ہیں۔ اور یہ تعداد غزہ میں ویسٹ بینک کے بہ نسبت زیادہ ہے۔ بچوں کی بیماریاں اور کم عمری میں موت طبی امداد اور موجودہ سہولتوں پر سوال کھڑا کرتی ہے۔

۲۰۱۱-۱۲ء کے اعداد وشمار کے مطابق 67.2 فیصد اسکول ایسے تھے جن میں لیبارٹری کے لئے مخصوص کمرے موجود تھے، جس میں 71.1 فیصد سرکاری اسکول 59.2 فیصد 'وکالۃ الغوث' کے تحت چلنے والے اسکول اور 53.2 ر فیصد پرائیویٹ اسکول ہیں۔ تعلیمی سال ۲۰۱۱-۱۲ء کے اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ فلسطینی اسکولوں میں ۱۱،۲۹،۵۳۸ ر طلبہ و طالبات زیر تعلیم ہیں جس میں لڑکیوں کی تعداد

50.2٪ فیصد ہے۔ 75.5٪ فیصد اسکولوں میں مستقل لیب (lab) موجود ہیں، جس میں 78.8٪ فیصد حکومتی، 71.7٪ فیصد وکالۃ الغوث کے، اور 61.3٪ فیصد پرائیویٹ اسکول ہیں۔ وہیں 75.7٪ فیصد اسکولوں میں کمپیوٹر کی تعلیم علیحدہ مخصوص کمروں میں ہوتی ہے۔ تعلیمی سال ۱۲-۲۰۱۱ء کے ابتدائی مراحل میں 2.8٪ فیصد طلبہ اور 2.6٪ فیصد طالبات ناکامیاب ہوئیں۔ وہیں ثانویہ میں ناکام ہونے والے طلبہ وطالبات کا فیصد علی الترتیب 2.4٪ اور 2.1٪ رہا۔

۱۰٪ سے ۱۷٪ سال کی عمر کے 75.1٪ فیصد طلبہ کمپیوٹر استعمال کرتے ہیں جس میں 76.7٪ فیصد طلبہ ہیں، جبکہ اس کے برعکس طالبات کی نمائندگی 73.5٪ فیصد ہے۔ فلسطین کے ۱۰٪ میں سے ۴٪ طلبہ انٹرنٹ کے استعمال سے واقف ہیں، اور استعمال بھی کرتے ہیں جبکہ ۲٪ فیصد طلبہ ایسے ہیں جو استعمال کرنا جانتے تو ہیں لیکن مواقع میسر نہ ہونے کے باعث اس کے استعمال سے قاصر ہیں، جبکہ بقیہ ۴٪ فیصد بچے استعمال سے ہی واقف نہیں ہیں۔

۲۰۱۲ء کے اعداد وشمار کے مطابق ۱۰٪ سے ۱۷٪ سال کی عمر کے ۶۰٪ فیصد بچے اپنی خراب معاشی حالت کی وجہ سے روزگار سے وابستہ ہونے پر مجبور ہیں۔ واضح رہے کہ ان میں لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کے مقابل کہیں زیادہ ہے۔ اسی عمر کے 2.2٪ فیصد بچے ایسے ہیں جو پڑھائی اور کام دونوں ایک ساتھ کرتے ہیں۔

جولائی ۲۰۱۱ء کے بعد سے ۱۲٪ مہینوں میں فلسطین کے ۱۲٪ سے ۱۷٪ سال کی عمر کے ۳٪ فیصد بچے جسمانی تشدد کا شکار ہوئے ہیں ۔ وہیں ۶٪ فیصد لڑکے اور 1.2٪ فیصد لڑکیاں بھی ذہنی تشدد کا شکار ہوئیں۔ فلسطین کے ۲۰٪ فیصد خاندان غریب ہیں جس میں 22.7٪ فیصد خاندانوں میں بچے ہیں، جبکہ 13.2٪ فیصد خاندانوں میں بچے نہیں ہیں۔ غزہ میں صاحب اولاد خاندانوں کی غریبی برابر بڑھتی جارہی ہے۔ اگر عمر کے لحاظ سے غریبی پر نظر ڈالیں تو 27.2٪ فیصد بچے فلسطین میں غریب ہیں۔

مندرجہ بالا رپورٹ گرچہ بہت خوش کن نہیں ہے، لیکن ان فلسطینی بچوں کی حالت میں کچھ بہتری کی جانب اشارہ کرتی ہے، اور اگر یہ تنظیمیں اپنے کام کو مزید ذمہ داری کے ساتھ اسی طرح انجام دیتی رہیں تو ایک ایسا دن ضرور آئے گا جب یہ سارے فلسطینی بچے اپنے حقوق حاصل کرتے ہوئے دنیا کے دوسرے ممالک کے بچوں کی طرح ایک خوشگوار زندگی سے لطف اندوز ہوں گے۔

●●

نظم "چند روز اور مری جان!": ایک جائزہ

ثاقب عمران فلاحی، ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ترقی پسند تحریک کا باقاعدہ آغاز 1935ء میں ہوا تھا،لیکن اس تحریک کے لیے بہت پہلے سے فضا تیار ہوچکی تھی۔ برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام پر جو مظالم کیے اسی کا نتیجہ تھا کہ انھیں 1857ء میں غدر کا سامنا کرنا پڑا۔ آزادی کی اس جدوجہد میں ہندوستان کی کئی ریاستیں شامل تھیں، چنانچہ انگریزوں کا اس پر سخت ردعمل فطری تھا۔ غدر کی پاداش میں ہندوستانی عوام پر انگریزوں نے ظلم کے دہانے کھول دیئے۔ جس طرح سے برطانوی حکومت نے ہندوستانی عوام پر ظلم وزیادتی کی اور سخت سے سخت اذیتوں میں انھیں مبتلا رکھا، اس سے یہ بات صاف نظر آرہی تھی کہ اب عوام اپنے صبر کا زیادہ دیر تک امتحان نہ دے پائیں گے اور جلد ہی اپنی آزادی کے لیے ایک بار پھر انگریزوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے۔

1917ء کے بعد سے ہندوستانی عوام میں سخت بے چینی کی لہر دوڑنے لگی تھی اور صاف طور پر محسوس کیا جانے لگا تھا کہ ہندوستانی عوام برطانوی حکومت کے رویوں سے بالکل خوش نہیں ہیں، اور اس سے نجات چاہتے ہیں۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1917ء میں لینن کی قیادت میں روس میں مزدوروں کی تحریک یعنی مارکسی نظریے کی جیت ہوچکی تھی۔ اس جیت کا اثر دیگر ممالک پر بھی اپنا رنگ دکھانے لگا تھا۔ ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوششیں عرصۂ دراز سے جاری تھیں، لیکن یہ تمام کوششیں ابھی تک منظّم نہیں ہو پارہی تھیں، یعنی یہ کوششیں مخصوص علاقوں تک محدود تھیں۔ جبکہ ضرورت تھی کہ پورے ملک کے عوام ایک ساتھ اُٹھ کھڑے ہوں اور ایک ساتھ اپنی اور اپنے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں۔

اس تحریک میں ترقی پسندوں نے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں نے عوام کو بیدار کرنے کے لیے ادب کو ذریعہ بنایا۔ انھوں نے ادب کا رشتہ سماج سے جوڑا اور یہی وجہ تھی کہ منشی پریم چند نے ترقی پسند تحریک کی پہلی کانفرنس میں اپنے صدارتی خطبے کے ذریعے یہ بات تمام ادیبوں کے ذہن نشین کر دی تھی کہ "ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔" ترقی پسند تحریک سے قبل تک ادب میں زیادہ تر عشق و عاشقی کی باتیں ہی ہوتی رہی تھیں۔ ترقی پسندوں کے یہاں بھی عشق و عاشقی خاص موضوع تھا، لیکن حالات اب

پہلے سے الگ تھے، اب عشق معشوق کے موہوم وجود یا اس کی زلفوں کی چھاؤں کا متلاشی نہیں تھا بلکہ اب اس کا معشوق ملک اور اس کا عشق ملک کی آزادی تھا۔

ترقی پسند تحریک کی کوششوں کے ذریعہ پورے ملک میں آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شاعروں کے نغمے اب عوام کو سلانے کا نہیں بلکہ انھیں بیدار کرنے کا کام کرنے لگے۔ عوام کے خون کو گرمانے اور ان کے اندر جوش و جذبہ پیدا کرنے کی بھرپور کوشش شروع ہوگئی۔ ایک طرف جہاں آزادی حاصل کرنے کی کوشش تیز تر ہوتی جا رہی تھی تو دوسری طرف شاعر انھیں تحریک آزادی کی کامیابی کا یقین بھی دلاتے جاتے تھے کہ ہمت نہ ہارو، بہت جلد ہمیں آزادی حاصل ہو جائے گی۔ فیض احمد فیضؔ کی نظم ''چند روز اور مری جان!'' کا پس منظر یہی جدوجہد آزادی اور آزادی کی امید ہے۔

فیض احمد فیضؔ ترقی پسند شاعروں میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے جب ادبی دنیا میں قدم رکھا، اس وقت ہندوستان برطانوی حکومت کا غلام تھا، اور ملک بھر میں آزادی کی لَے تیز ہوتی چلی جا رہی تھی اور ہر طرف سے آزادی کا نعرہ بلند ہونے لگا تھا۔ مجاہدین آزادی اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر آزادی کا علم بلند کرتے اور انگریز حاکم انھیں سخت سزائیں دیتے۔ اس کے باوجود ہندوستانی عوام کا جذبہ ذرا بھی متزلزل نہیں ہوتا تھا اور آزادی کے یہ متوالے تہیہ کر چکے تھے کہ پیچھے نہیں ہٹیں گے اور ملک کو آزاد کرا کر ہی دم لیں گے۔ ایسے موقع پر فیض احمد فیضؔ بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں:

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

اس نظم کے مطالعے سے احساس ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش کس قدر زور پکڑ چکی تھی اور فیضؔ اس کوشش سے کتنے پرامید تھے کہ اگر ہم اسی طرح اپنی دھن پر قائم رہے تو وہ دن بہت جلد آ جائے گا جب ہم آزاد ہندوستان کی فضا میں سانس لے رہے ہوں گے۔ لیکن کیا یہ سب اتنا آسان تھا؟ نہیں! ہرگز نہیں۔ بلکہ اس جدوجہد آزادی کے دوران ہندوستانیوں پر بہت مظالم ہوئے۔ اسی لیے فیضؔ کہتے نظر آتے ہیں:

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم

اور جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

تو ہمارا ذہن ماضی کے ان صفحات کو پلٹنے لگتا ہے جن پر صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ ہمارے ہی آباء و اجداد میں سے بعض افراد نے انگریزوں سے ساز باز کر کے اپنے ہی لوگوں کے خلاف ان کی مدد کی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے ہندوستان کو تھال میں سجا کر انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا

تھا۔انگریز تو یہاں ایک تاجر کی شکل میں آئے تھے لیکن اس وقت ہندوستان میں نااتفاقیاں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان میں اپنے پیر پھیلانے شروع کر دیئے۔ وہ ایک حکمراں کی مدد کرتے اور بدلے میں اس سے ہیرے جواہرات کے ساتھ ساتھ اراضی بھی لیتے۔ پھر کبھی دوسرے حکمراں کی مدد کرتے اور اس کی حکومت کا کچھ حصہ ہڑپ کر جاتے۔ وہ اپنا کھیل کھل کر کھیلتے رہے لیکن ہندوستانیوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور وہ انگریزوں کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ گردانتے رہے۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ برطانوی حکومت کا پرچم ہندوستان پر لہرانے لگا اور ہندوستانیوں کے لیے حالات یہاں تک خراب ہو گئے کہ

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں

برطانوی حکومت کے خلاف آواز اُٹھانے والے کو قید میں ڈال دیا جاتا۔ یہاں تک کہ ہندوستانیوں کو اپنے جذبات کے اظہار کی بھی اجازت نہ تھی۔ بظاہر تو ہندوستانی عوام برطانوی حکومت کے زیر اقتدار آزاد تھی لیکن اس کی آزادی وہاں ختم ہو جاتی تھی جہاں برطانوی حکومت کے خلاف اس کے ذہن میں خیالات پنپنے شروع ہوتے تھے۔ حکومت کے خلاف کسی بھی طرح کا عمل انھیں اذیت میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ایسے حالات میں؛

اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں

یہاں ایک سوال اور ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ لوگ جو حکومت کے خلاف کسی طرح کا ردعمل نہیں ظاہر کرتے تھے یا حکومت کی مخالفت کرنے سے باز رہتے تھے، وہ آزاد تھے؟ کیا انھیں ہر طرح کی آزادی میسر تھی؟ ایسا نہیں تھا۔ برطانوی حکومت نے ہندوستان پر اپنے پاؤں صرف تجارت کی غرض سے رکھے تھے اس لیے وہ یہاں امن بحال کرنے کے بجائے عوام پر طرح طرح کے ٹیکس لگاتے اور اس کو وصول کرنے کے لیے ان پر طرح طرح کے ظلم روا رکھتے تھے۔ ہر جانب افراتفری کا ماحول تھا۔ اس وقت ہندوستان اور ہندوستانیوں کی حالت ایسی تھی کہ

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

یہاں تک ہندوستانی عوام کا درد اور اس کی تکلیفوں کو بیان کر لینے کے بعد فیضؔ احمد فیضؔ ایک مرتبہ پھر ہندوستانیوں کے اندر امید کی کرن جگاتے ہیں، انھیں پھر سے تازہ دم ہونے کے لیے کہتے ہیں؛

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اِک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

زمانے کی گردش کا عمل مسلسل جاری ہے۔شاید یہی وجہ ہے کہ ہر انسان ہمیشہ ایک مقام پر نہیں رہتا بلکہ اس کے حالات میں تغیرات رونما ہوتے رہتے ہیں۔کبھی وہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہو جاتا ہے تو کبھی زمانے کی گردش میں پھنس کر اپنی ساری آسائش و آرائش کھودیتا ہے۔فیض احمد فیضؔ کو بھی اس بات کا بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ بہت جلد ایسا وقت آئے گا جب مظلوم ہندوستانیوں کو ظالم انگریز حکمرانوں سے نجات مل جائے گی۔شاعر چونکہ بہت حساس عقل وخرد کا مالک ہوتا ہے اس لیے وہ عام انسان سے زیادہ بہتر طریقے سے حالات کو سمجھ لیتا ہے اور پھر اسے شاعری کے پیکر میں ڈھال کر لوگوں کو اس سے متعارف کراتا ہے۔فیضؔ بھی اس بات کو سمجھ چکے تھے کہ انگریزی حکومت کا سورج بہت جلد غروب ہوجائے گا۔اس لیے وہ کہتے ہیں؛

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

درج بالا اشعار سے صاف طور پر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ فیضؔ کو پوری امید تھی کہ ملک بہت جلد آزاد ہوجائے گا۔اگر کسی شخص کو ظالم کے ظلم سے نجات ملنے کی امید نظر نہ آتی ہو تو اس کی باتوں میں حسرت و مایوسی کا گزر زیادہ ہوگا۔اسے جب ہر طرف اندھیرا ہی نظر آئے گا تو روشنی کی امید وہ کس بنا پر کرے گا۔اس کے برعکس اگر اسے ہلکی سی امید بھی ہوگی آزاد ہونے کی تو اس کا بات کرنے کا انداز اور لہجہ جداگانہ ہوگا۔یہی حال فیض کا بھی نظر آتا ہے۔اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ اجنبی یعنی انگریزوں کے مظالم کو آج تو ہم سہہ رہے ہیں لیکن ہمیشہ ان کا ظلم نہیں سہنا ہوگا۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر ہندوستانی عوام کے درد کو وہ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں؛

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار

ان تمام آلام و مصائب کی جانب اشارہ کرنے کے بعد پر جوش اور پر امید لہجے میں ایک مرتبہ پھر سے کہتے ہیں؛

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

منشُورات کی نئی پیشکش

میر بابر مشتاق کی ایک اہم تصنیف

اخوان المسلمون

اور

فرعونیت کی کشمکش

قیمت:
₹249

مصر کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت حال کے پس منظر پر ایک مستند دستاویز۔

ایک، دو نہیں ہزاروں داستاں ہائے عزیمت ہیں، جو اخوان کے فرشتہ صفت کارکنان اور قائدین مسلسل رقم کر رہے ہیں۔ ساری دنیا کا سرمایہ، مہیب ذرائع ابلاغ اور عالمی سازشی عناصر، خونی جنرل سیسی کی سرپرستی کر رہے ہیں، لیکن جنت کو اپنی اصل منزل قرار دینے والوں کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شک نہیں پیدا ہوا کہ وہ ناکام ہوں گے۔ اپنی حتمی فتح اور اللہ کی نصرت پر کامل یقین رکھنے والوں کو آخرت ہی نہیں، دنیا میں بھی کامیابی پر کوئی ادنیٰ شک نہیں کہ یہی اللہ کا وعدہ، فیصلہ اور حتمی پیغام ہے۔

(کتاب سے اقتباس)

منشُورات
پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

E-61، اسکالر اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی۔ ۲۵ فون: **09212135335, 09810650228**
ای میل: **manshuratindia@gmail.com**
ویب سائٹ: **www.manshurat.in**

تعارف وتبصرہ

عبدالرحمن خالد فلاحی، جامعۃ الفلاح

احیاء اسلام کی عالمی جدوجھد اور موجودہ چیلنجز

مصنف: ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی،

صفحات: ۲۸۲، **قیمت**: ۲۵۰، **ناشر**: ادارہ علمیہ جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڑھ

کتاب کے مشمولات کچھ اس طرح ہیں: احیاء دین ایک مقدس مشن، احیاء اسلام کی عالمی جدوجہد، احیاء وتجدید کی چند عالمگیر تحریکات، اسلام اور خارجی چیلنجز۔ آج امت مسلمہ بالعموم اور اقامت دین یا احیاء اسلام کی کوششوں میں مصروف افراد اور جماعتوں کو بالخصوص داخلی اور خارجی دو قسم کے چیلنجز سے سابقہ ہے۔ داخلی چیلنجز کچھ اس طرح ہیں: ایمان وایقان کی کمزوری، نفاق کا مرض، اتحاد واتفاق کا فقدان، دین کا ناقص فہم، بے جا مصلحت پسندی، روحانیت کا فقدان، مادیت کا غلبہ، تقلید جامد اور غیر مقلدیت کی ہٹ دھرمی، تعصبِ بے جا، مایوسی وقنوطیت کا غلبہ، تعلیم وتربیت کی کمی، تقوی سے دوری۔ خارجی چیلنجز اس طرح ہیں: مذہب کو زندگی سے بے دخل کر دیا جائے، بدلتے ہوئے حالات میں اسلام کافی وشافی حل نہیں رکھتا، اسلام یہودیت وعیسائیت کا خوشہ چیں ہے، اسلام علم کا مخالف ہے، اسلام کے بارے میں ذرائع ابلاغ کا منفی رویہ، استشراق کی جانب سے فکری یلغار۔ داخلی چیلنجز کا سامنا مومنانہ صفات کے ساتھ اسلام کے مکمل احکامات پر عمل پیرا ہوکر ہی ممکن ہے، ایک مومن کے قول وعمل میں تضاد نہ ہو، اس کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہو۔ خارجی چیلنجز کا سامنا اس طرح ممکن ہے کہ ان کی طرف سے اسلام پر عائد کردہ الزامات اور بہتان تراشیوں کا خود ان کی زبان میں مسکت جواب دیا جائے۔ کتب مقدسہ میں تحریفات وترمیمات، ان کی دینی ومذہبی موشگافیوں، فکری وعلمی خیانتوں اور تہذیبی ومعاشرتی بے حیائیوں کو بے نقاب کیا جائے۔

خدا کی بستی میں (سفرنامہ لاهور و اسلام آباد)

مصنف: ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی،

صفحات: ۲۳۰، **قیمت**: ۱۲۰، **ناشر**: القلم پبلی کیشنز، بارہمولہ، کشمیر

کسی بھی سفرنامہ میں اس جگہ کے احوال وکوائف، اور تعلیمی، معاشی اور تہذیبی مشاہدات کا باریک بینی کے ساتھ

تجزیاتی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے، لیکن یہ سفرنامہ کچھ الگ نوعیت کا ہے، چونکہ مسافر علمی سفر پر گیا تھا، بقول مصنف: سفر کا مقصد اپنے ڈاکٹر آف فلاسفی کے موضوع 'اسلامی ریاست میں شوریٰ کا تصور اور اس کی معاصر تعبیرات' پر تحقیقاتی مواد فراہم کرنا تھا، اس کے لیے لائبریریوں اور مکتبات کی خاک چھاننی پڑی۔ ایک تحریک سے وابستہ ہونے کے باعث وہاں اجنبیت کا احساس نہیں ہوا، رفقاء نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور مختلف لائبریریوں اور مکتبات کا مشاہدہ کرایا، اور بڑی بڑی علمی اور دعوتی سرگرمیوں میں مصروف لوگوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا''۔ اس سفرنامے میں مختلف شخصیات اور ان کی خدمات کا مختصر مگر جامع تعارف پیش کیا گیا ہے جس کے باعث اس کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے، ساتھ ہی سفرنامہ علمی و ادبی چاشنی سے بھی پُر ہے۔

اردو ہے جس کا نام.....

مصنف: آفتاب عالم نجمی،

صفحات: ۵۵۵، **قیمت:** ۳۵۰، **ناشر:** علیشا پبلی کیشنز دودھ پور علی گڑھ

یہ سول سروسز، یو جی سی، پی جی ٹی، ٹی جی ٹی کی تیاری کے لیے تیار کردہ گائیڈ ہے، اس کو بہت ہی معروضی انداز سے مرتب کیا گیا ہے تاکہ امہات کتب کی ورق گردانی کے بجائے یہ گائیڈ ہی کافی ہو۔ مصنف نے اس کو معلومات افزا بنانے اور جدت پیدا کرنے کی خوب کوشش کی ہے۔ مسابقاتی امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبہ وطالبات کے لیے یہ ایک اچھی پیشکش ہے، مختصر یہ کہ یہ کتاب کوزے میں دریا بند کردینے کی مصداق ہے۔

تدبر قرآن کے اصول اور وسائل

مصنف: ڈاکٹر طہ جابر العلوانی، **مترجم:** ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی،

صفحات: ۲۴۸، **قیمت:** ۱۳۵، **ناشر:** انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مشمولات اس طرح ہیں: خدمت قرآن کی تاریخ، تدبر کے وسائل، علم تدبر کی تشکیل وغیرہ۔ صحیح ترتیل اور قرار واقعی تلاوت کے بعد قرآن پر تدبر کو ایک قائم بالذات علم قرار دیا جاسکتا ہے، جس کے دو پہلو ہیں: ایک نظریاتی پہلو ہے، جس میں تدبر کے وسائل بیان کئے جاتے ہیں جو طالب علم کی مدد کرتے ہیں کہ وہ کس طرح قوائے شعور کو تدبر کے عمل میں لگائے: (۱) تلاوت کرنے اور سننے والا عبادت کی نیت کرے۔ (۲) قرآن کی آیات اور سورتوں کے درمیان باہمی ربط ہے اس طرح قرآن کریم میں وحدت ہے۔ (۳) سورتوں کا عمود۔ (۴) آیات کی موضوعاتی تقسیم۔ (۵) علم مناسبت (علم نحو وقواعد) سے واقفیت۔ (۶) تدبر کرنے والا غیب وشہادت کی دونوں دنیا کو مستحضر رکھے۔ (۷) خدا، انسان اور کائنات کے درمیان تعلق۔ (۸) حق وباطل کے درمیان کشمکش جیسے اہم امور کو ملحوظ رکھے۔ دوسرا تطبیقی پہلو ہے جس کو انجام دیتے ہیں تربیت یافتہ باصلاحیت مربی، جنھوں نے سخت محنت وریاضت کی ہے تاکہ وہ کلمات خداوندی کے لیے نرم ہو، اور قرآن کے جلال وجمال اور اس کی رعنائی سے ان میں خشوع وخضوع اور انابت کی کیفیت پیدا ہو۔ جب صورت حال یہ ہے کہ حقیقت تدبر کے ادراک کے لیے مشق وممارست کی

ضرورت ہے تو حاملین قرآن کا فرض ہے کہ وہ اساتذہ، معلمین، خطباء وداعیانِ دین کے تدریسی وتربیتی پروگراموں میں ضرور شامل ہوں۔

اسلام کا عام فہم تعارف

مصنف: علی طنطاوی، **مترجم**: عبدالحلیم فلاحی،

صفحات: ۲۴۰، **قیمت**: ۹۰، **ناشر**: الفلاح پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

مصنف نے اسلامی عقیدے کے مسائل پر بالکل جدید ترین اسلوب اور سائنٹفک انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ عقیدے کے ان موضوعات پر گفتگو کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے متعلقہ موضوع پر سیر حاصل اور مدلل گفتگو کرتے ہیں پھر خلاصہ بحث پیش کرتے ہیں اور اس بحث پر وارد ہونے والے ممکنہ شبہات کا ذکر کرتے ہیں اور پھر خود ہی ان کا ازالہ کرتے ہیں۔ اردو زبان میں اس کتاب کے متعدد ترجمے دستیاب ہیں لیکن مترجم کو اس بات کا احساس رہا کہ کتاب کا ترجمہ نہ کر کے صرف ترجمانی سے کام لیا گیا ہے، چنانچہ اس ترجمہ میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دینی تعلیم- اصلاح وجمود کی کشمکش کا مطالعہ

مصنف: ڈاکٹر طہ جابر العلوانی، **مترجم**: ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی،

صفحات: ۱۴۸، **ناشر**: انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

کتاب کے مشمولات پر ایک نظر: علوم ومعارف کا فیضان، دینی تعلیم کا نقطہ نظر وذاتی تجربات، دینی تعلیم کے لیے بعض تجاویز، منہجی مطالعوں کے نصابات، علوم القرآن کا مخصوص نصاب، فقہ واصول فقہ کا مخصوص نصاب، مراجعات، مناہج فکر اور فقہ استدلال، قرآن اور تربیت، علم النفس وغیرہ۔ دینی تعلیم کے جمود کے لیے مختلف حلقوں سے صدائیں آرہی ہیں کہ تعلیم اسلامی کو منسوخ کر دیا جائے اس کے سوتے خشک ہوگئے ہیں۔ یہ امت مسلمہ کی پسماندگی کی ذمہ دار ہے، اسی تعلیم کی وجہ سے علیحدگی پسندی کی فکر پروان چڑھتی ہے۔ تعصب، انتہا پسندی کو اسی نظام نے پروان چڑھایا ہے اور دوسروں کی تردید اور عدم برداشت کا کلچر اسی فکر کی دین ہے (ص۱۳)۔ یہ بحران طرز تعلیم کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ سیکولر لادینی نظام کے تسلط کے سبب ہے جس کی خصوصیات مختلف اور متضاد ہیں، اور اس کی نمایاں ترین خصوصیت وحی اور غیب سے تعلق رکھنے والی ہر چیز سے نفرت ووحشت کا اظہار ہے، اور اس طرز تعلیم کو علم وسائنس سے بے تعلق اوہام وخرافات کا پلندہ قرار دینا ہے۔ جبکہ مدارس کے نظام تعلیم کی خوبی یہ ہے کہ موثر اور فعال ہونے کے ساتھ ساتھ یہ سادگی اور آسانی کا ایک انمول نمونہ ہے، یہ سادگی یہاں جملہ عناصر پر محیط ہے، خواہ استاد ہو یا طالب علم، یا اسکول۔

دینی تعلیم کی اصلاح ومعاصر علوم سے ہم آہنگی کے لیے قرآن کریم کی روشنی میں اور سیرت طیبہ کی تفسیر وتطبیق سے رہنمائی حاصل کر کے ہم تعلیم کے نظام کی اصلاح کریں۔ علوم نقلیہ کی تعلیم کی اصلاح ہمارے اسلامی ورثہ کے اندرون سے ہو، اور اس کی تشکیل جدید کے مقصد سے نظر ثانی کے عمل میں دلچسپی لی جائے۔ علوم اسلامیہ کے

اجتماعی، انسانی اورعمرانی علوم کوتغیر پذیر انسانی زندگی سے مربوط کیا جائے۔ علماء اپنے تجربات سے مغرب کے چیلنجز کا سامنا کریں۔ اپنے علم میں وسعت کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر اور فکری دنیا کے افق کو وسیع تر کریں، تاکہ پورے تعلیمی عمل کو اصلاح کے عمل سے گزارا جاسکے۔ مصنف نے اپنے نظریہ کی روشنی میں دینی تعلیم کی اصلاح کے لیے بعض تجاویز پیش کی ہیں، جنہیں علوم القرآن، علوم الفقہ اور اصول الفقہ کے شعبوں میں تطبیق دے کر دیکھا جاسکتا ہے، مزید برآں ان اصولوں کو علم النفس، علم الکلام اور فلسفہ وغیرہ کے شعبوں میں بھی تطبیق دی جاسکتی ہے۔ یہ اچھی رہنمائی ہے، اس طرح اپنے حالات وضروریات کے مطابق ترمیم وتبدیل کے بعد قدیم وجدید علوم کو ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے، اور اس طرح دینی تعلیم کے جمود کا خاتمہ ممکن ہے۔

حفظ قرآن کے رهنما اصول

مصنف: ذکی الرحمٰن غازی،

صفحات: ۸۰، **قیمت:** ۴۰، **ناشر**: اریب پبلی کیشنز، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

فن قرأت وتجوید پر یہ کتاب دس حفاظ وقراء کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ سوالات یکساں ہیں۔ اس کتاب کو درحقیقت حفظ وقرأت سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ سوال کچھ اس طرح ہیں: حفظ کا بہترین طریقہ؟ حفظ کے لیے مناسب اوقات؟ حفظ کا آغاز؟ متشابہ آیات کی معرفت کا طریقہ؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ چند منتخب سوالات تھے حفظ قرآن کے متعلق، جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآن کے حفظ وحفاظت اور یاد وتحفظ کی ذمہ داری تو خود اللہ نے لے رکھی ہے۔ آدمی کے قرآن سے تعلق ولگاؤ اور محنت پر منحصر ہے کہ وہ کب اور کتنے اوقات میں یاد کرتا ہے، اور اسے اپنے سینے میں محفوظ رکھتا ہے۔

مطالعه قرآن کے رهنما اصول

مصنف: ذکی الرحمٰن غازی،

صفحات: ۲۰۰، **قیمت:** ۸۵، **ناشر**: اریب پبلی کیشنز، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

یہ کتاب تین ابواب اور دو ضمیموں پر مشتمل ہے، مشمولات اس طرح ہیں: قرآن مجید کا تعارف، تدبر کے معنی وعلامات، مطالعہ قرآن کے رہنما اصول، قرآن وصیام، رشتۂ زوجین پر قرآنی تشبیہ کا مطالعہ۔ مصنف مطالعہ قرآن کے رہنما اصولوں کے ضمن میں لکھتے ہیں: (۱) قرآن سے محبت (۲) قرآن کا گہرا علم وآگہی (۳) نمازوں میں کثرت کے ساتھ قرآن پڑھنے کا اہتمام (۴) مطالعہ قرآن کا اعادہ وتکرار (۵) قرآن کے حفظ کا اہتمام (۶) الفاظ ومعانی کو باہم مربوط کر کے غور وفکر کرنا (۷) آیات کی تکرار تاکہ مخفی پہلوؤں کا استحضار ہوجائے۔ ان اصول وضابطوں کے تحت مطالعہ کرنے سے ہمارے لیے حیات قلبی، قوت حافظہ، صحت نفسی، علوہمتی اور پختہ حوصلگی جیسی صفات کا حصول ممکن ہوگا۔

اصلاح اورآزادی کا طریقہ کار

مصنف: ڈاکٹر صلاح الدین سلطان، **مترجم**: ابوالاعلی سید سجانی،
صفحات: ۱۵۱، **قیمت**: ۸۰/روپے، **ناشر** : ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی (اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی)

مصنف نے سورہ الحشر کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، جبکہ اس میں پانچ دیگر ضمیمے بھی شامل ہیں۔ مترجم نے سلیس اورآسان زبان میں کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کا مقصد امت کے ذہن میں یہ یقین پیدا کرنا ہے کہ صہیونیوں کی ساری تیاریاں اللہ کے عذاب نیز مجاہدین کی قوت اور ثبات قدمی کے سامنے نہیں ٹک سکیں گی۔ نیز ان کے ساتھ ہمارے معرکہ کا انجام یہ ہوگا کہ ہمیں اللہ کے اذن سے نصرت اور غلبہ نصیب ہوگا اور ان کے اموال ہمیں مال غنیمت کے طور پر مل جائیں گے، لیکن ضرورت ہے کہ پہلے اخلاص وقوت پیدا کریں اور غلبہ اسلام کے لیے جدوجہد کریں۔ ہمارے اندر خوداری وخوداعتمادی پیدا ہو، اس کے لیے اللہ کے حضور گریہ وزاری کریں اور اسی سے مدد طلب کریں۔ اصلاح سے مقصود اپنے اندر اخلاص، انفاق فی سبیل اللہ کی قوت اور اشاعت اسلام کے لیے جدوجہد نیز اسلامی خودداری پیدا کرنا ہے۔ آزادی سے مقصود یہود ونصاری کے پنجہ استبداد سے چھٹکارا حاصل کرنے کا طریقہ کار ہے۔ محترم نے طریقہ کار کے لیے غزوات رسولؐ سے بخوبی استشہاد واستدلال کیا ہے۔

قبلہ کا کردار امت کی تشکیل میں

مصنف: ڈاکٹر صلاح الدین سلطان، **مترجم**: ابوالاعلی سید سجانی
صفحات: ۸۷، **قیمت**: ۸۰، **ناشر** : ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ (اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی)

عناوین اس طرح ہیں: تحویل قبلہ، ہمارا قبلہ اور جامد ومتحرک امت کے خصائص، تحویل قبلہ کی آیات میں امت کے خصائص، جامد امت کے خصائص، ہمارا قبلہ اور جمود سے ارتقاء کی طرف، قبلہ اعتدال کی علامت بن جائے۔ مصنف کا امت سے یہ مطالبہ ہے کہ قبلہ کو توحید کے حرکی تصور اور تمام اہل قبلہ کے درمیان مضبوط اتحاد کی علامت کا درجہ دیا جائے۔ معتدل اور متوازن منہج اختیار کیا جائے۔ یقیناً قبلہ کے تعلق سے ہماری ذمہ داریاں بہت اہم ہیں کہ اسے آباد بھی رکھا جائے، اور تمام دشمنوں سے اس کو محفوظ بھی رکھا جائے۔ مصنف کے مطابق متحرک امت کی خصوصیت ہے کہ وہ متحد امت ہوتی ہے وہ علمی سبقت رکھتی ہے اس کے پاس تربیت اور تزکیہ کا اپنا ایک منہج ہوتا ہے اور اس کا ایک خاص نظام اور ایک مضبوط قیادت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جامد امت کا عقیدہ فاسد ہوتا ہے، عقلیں جمود کا شکار ہوتی ہیں دل سخت ہوتے ہیں، محنت وجستجو سے دور ہوتے ہیں، اور اپنے ذہن ودماغ سے فیصلے نہیں کرتے۔ اس طرح مصنف نے قبلہ اول پر ہونے والی فکری یلغار اور فلسطینیوں پر ظلم وبربریت پر مسلمان کو متحد اور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب علمی اور فلسفیانہ اسلوب میں ہے، اس کے پیغام کو عام فہم زبان میں عوام الناس تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

●●

آپ کے خطوط

گزشتہ چند ماہ سے کوشش ہے کہ حیات نو کی ترسیل کسی طرح ملک کے بیشتر معروف علمی حلقوں تک یقینی بنائی جائے۔ الحمدللہ مجلّہ سے متعلق مختلف شخصیات اور اداروں کی جانب سے کافی اچھے تأثرات سامنے آئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا نیاز احمد ندوی، مدرسۃ الاصلاح کے شیخ التفسیر مولانا عمر اسلم اصلاحی، مفسر قرآن مولانا سید حامد عبدالرحمٰن الکاف (یمن)، اور ملک کی متعدد اہم شخصیات کی جانب سے بذریعہ فون کافی حوصلہ افزا تأثرات موصول ہوئے، فجزاہم اللہ خیر الجزاء۔ صفحات کی قلت کے سبب جملہ تأثرات کو شامل اشاعت کرنا ممکن نہ تھا، چنانچہ معذرت کے ساتھ محض چند تحریری تأثرات کی اشاعت پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ **مدیر)**

مولانا محمد فاروق خاں، معروف اسلامی دانشور و مترجم قرآن مجید ہندی

'حیاتِ نو' انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان ہے۔ جولائی تا ستمبر 2013 کا شمارہ میرے پیش نظر ہے۔ 'اپنی بات' کے تحت اداریہ کے علاوہ اس شمارہ میں مسئلہ عقیدۂ تقدیر، مطالعہ سیرت نبوی اور عالمِ عرب کے حالات کے سلسلہ میں قابلِ مطالعہ مضامین شامل ہیں۔ مضمون 'اردو تراجم قرآن پر ایک تنقیدی نظر' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح کے علمی اور تنقیدی مضامین حیاتِ نو میں شائع ہوتے رہیں تو بہتر ہوگا۔

یادِ رفتگاں کے تحت اُردو زبان کے معروف ادیب و شاعر شبنم سبحانی کی رحلت پر راشد حامدی فلاحی نے اپنے تأثرات لکھے ہیں، جس میں مرحوم کی خدمات اور ان کی سرگرمیوں پر اور ان کی گونا گوں خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تعارف و تبصرہ کے تحت مرحوم نثار احمد فاروقی کی شخصیت پر 600/صفحات پر مشتمل کتاب کا تعارف کرایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد علمی و تحقیقی دنیا میں کتنا زبردست خلا پیدا ہوگیا ہے۔ 'فارغین مدارس کا مطلوبہ کردار' اس کالم کے تحت مختلف حضرات کی طرف سے جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے، یقیناً وہ لائق توجہ ہیں، فارغین مدارس کے لیے اس میں رہنمائی کا بڑا سامان ہے۔ (بشکریہ: ماہنامہ اردو بک ریویو، جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء)

مولانا نعیم الدین اصلاحی، شیخ التفسیر والحدیث، جامعۃ الفلاح

سہ ماہی مجلّہ ''حیات نو'' بلریاگنج کا شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء پیش نظر ہے۔ 'آپ کے خطوط' کے کالم میں

برادر محترم مولانا نسیم غازی فلاحی صاحب کا خط پڑھا۔ پورا خط لائق تحسین ہے۔ اللہ تعالی موصوف کو صحت دے اور زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

اس خط میں ایک چیز مجھے کھٹکی جس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ موصوف نے جناب سدید از ہر فلاحی کے مقالے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''سدید از ہر فلاحی کا مضمون 'عقیدہ تقدیر- ایک زندہ اور حرکی تصور' بہت اچھا ہے، البتہ صفحہ ۸؍ پر سورہ الحدید کی آیات: ۲۲؍،۲۳؍ میں "ما أصاب من مصيبة'' کا ترجمہ (روئے زمین پر جو مصیبت آتی ہے) کیا گیا ہے یا دیا گیا ہے وہ قابل توجہ ہے۔ اردو زبان میں مصیبت پریشانی کے لیے استعمال ہوتا ہے، غالباً اسی سے متأثر ہو کر عربی استعمال 'مصيبة' لفظ کا ترجمہ ''مصیبت'' کر دیا جاتا ہے جبکہ صحیح ترجمہ ہونا چاہیے ''جو بات یا چیز اچھی یا بری تمہیں پہنچتی ہے'' چنانچہ ان ہی آیات کے آخر میں اچھی چیز اور نعمت کا ذکر موجود ہے کہ تم نعمت پا کر اتراؤ نہیں، نیز اسی صفحہ کے آخر میں سدید از ہر صاحب نے جو حدیث پیش کی ہے اس میں اصابت کو مطلق ہونے یا پہنچنے کے معنی میں لیا ہے''۔ (سہ ماہی مجلّہ حیات نو، صفحہ: ۱۷؍ شمارہ: اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء)

اس سلسلے میں عرض ہے کہ مکتوب نگار کو 'اصابت' اور 'مصيبة' کے معنی سمجھنے میں بھول ہوگئی ہے کہ انہوں نے دونوں کا معنی ایک سمجھ لیا ہے حالانکہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ أصابَ يصيب جب فعل کی شکل میں ہوگا تو یقیناً اس کا معنی وہی ہوگا جس کی جانب موصوف نے رہنمائی فرمائی ہے، ''بات یا چیز (اچھی یا بری) تمہیں پہنچتی ہے'' ہوگا لیکن 'مصيبة' جب أصاب کے ساتھ مل کر آئے یا مطلق استعمال ہو، ہر حال میں اس کا معنی مصیبت اور آفت ہی ہوگا۔

چنانچہ مندرجہ ذیل آیات میں مصیبت کے یہی معنی تمام مترجمین نے لیے ہیں، جو غلط بالکل نہیں ہیں۔ مثلاً آیت ۲۲؍ سورۃ الحدید کا ترجمہ اسی طرح کیا گیا ہے:

[۱] نہیں پہنچتی کوئی مصیبت بیچ زمین کے اور نہ بیچ جانوں تمہارے کے۔ (شاہ رفیع الدینؒ، چہار ترجمہ قرآن)

[۲] آفت نہیں پڑے ملک میں اور نہ آپ میں۔ (شاہ عبد القادرؒ)

[۳] نہ رسد بشما ہیچ مصیبتے در زمین۔ (شیخ سعدی شیرازیؒ)

[۴] نہ رسید ہیچ مصیبتے در زمین۔ (حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)

[۵] کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی۔ (مولانا اشرف علی تھانویؒ)

[۶] کوئی مصیبت نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں۔ (فتح محمد جالندھریؒ)

یہ چھ ترجمے دو فارسی اور چار اردو کے بطور نمونہ پیش کیے ہیں، ان سب ترجموں میں 'مصيبة' کے معنی آفت اور مصیبت کے لیے گئے ہیں، اور اردو کے بالعموم مترجمین نے بھی اسی سے ملتا جلتا ترجمہ کیا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں تقریباً دس مقامات پر استعمال کیا گیا ہے، شاید ہی کوئی مترجم ہو جس نے مصیبت اور

آفت یا اس کے ہم معنی لفظ کے علاوہ کسی اور لفظ سے ترجمہ کیا ہو۔ البتہ أصــاب یـصیـب کا فاعل مصیبت بھی ہوسکتی ہے اور رحمت بھی۔

جیسے اس آیت میں ہے: ﴿ان تـصبك حسـنة تسؤهم وان تصبك مصيبة يقولوا قد أخذنا أمرنا من قبل ﴾ اگر تم کو آسائش ہوتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے اور کوئی مشکل پڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا کام پہلے ہی (درست) کر لیا تھا۔

یہاں أصــابت کا استعمال 'حسنة' اور 'مصيبة' دونوں کے ساتھ ہوا، لیکن 'مصيبة' کا استعمال چاہے اصــابة کے ساتھ ہو یا مطلق ہو اس کا معنی ہمیشہ آفت اور مصیبت کا ہوگا۔ 'مـصيبة' اسم فاعل مؤنث یہ خاص ہے آفت، مصیبت، حادثہ اور رنج وغم کے لیے، اس کا معنی کبھی بھی رحمت، نعمت، راحت کا نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ استعمالات عرب کے خلاف ہے۔ ایک حماسی شاعر کا مصرعہ ہے:

قليل التشكى للمصيبات حافظ

یہاں مصیبات کے معنی پہنچنے والی اچھی یا بری چیز نہیں ہے بلکہ یہاں حادثہ اور آفت کے معنی میں ہے۔ دیوان الحماسہ کے مشہور شارح مرزوقی نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

'والمعنى أنه لا يتألم للنوائب'۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حوادث زمانہ کا شکوہ بالکل نہیں کرتا۔

(شرح دیوان الحماسہ للمرزوقی، صفحہ:۵۸۰، دار الکتب العلمیۃ بیروت)

ہشام بن عقبہ کا شعر ہے:

ولـم تـنسـنـي اوفـى الـمـصيبـات بـعـده
ولـكـن نـكــأ الـقــرح بــالـقــرح أوجـع

اوفی کی یاد کو میرے دل ودماغ سے وہ مصائب وآلام محو نہ کر سکے جو اس کی موت کے بعد مجھے پیش آئے، بلکہ زخم کے ذریعہ زخم کا کریدنا نہایت ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

مصیبات کا ترجمہ مصیبتوں، آفتوں اور حوادث کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟ اسی طرح خطبوں میں اس کے شواہد موجود ہیں:

ان مـصيبتـه امَـنتـنـي مـن المصائب بعده۔ بیٹے کی موت کے صدمے نے اس کے بعد آنے والے تمام صدموں سے مجھ کو مامون ومحفوظ کر دیا۔ یعنی بیٹے کی موت کے صدمے سے بڑھ کر کوئی صدمہ ہوسکتا ہے! (الباب الثالث فی نثر الاعراب، صفحہ:۱۸)

ایک دوسری بدویہ کہتی ہے:

وان مـصيبتـي بـه هـونت على المصائب بعده۔ بیٹے کی موت نے اس کے بعد آنے والے

صدمات کو میرے لیے آسان بنادیا۔

(جمہرۃ خطب العرب، الباب الثالث فی نثر الاعراب: صفحہ ۳۶، مطبوعہ ادارۂ علمیہ جامعۃ الفلاح)

علامہ شبلی معرکہ احد کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:

''انصار میں سے ایک عفیفہ کے باپ، بھائی، شوہر اس معرکہ میں مارے گئے تھے۔ باری باری تین سخت حادثوں کی خبران کے کانوں میں پڑتی جاتی تھی لیکن وہ ہر بار یہی پوچھتی تھیں رسول اللہ کیسے ہیں؟ لوگوں نے کہا بخیر ہیں، اس نے پاس آکر چہرہ مبارک دیکھا اور بے اختیار پکار اٹھی 'کل مصیبة بعدك جلل'، تیرے ہوتے ہوئے سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

میں بھی، باپ بھی، شوہر بھی، برادر بھی فدا

اے شہِ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

(صفحہ: ۲۶۵، سیرۃ النبی، جلد اول، دار المصنفین ۱۹۹۶ء)

اس کے علاوہ کوئی بھی لغت اٹھا کر دیکھیں 'مصیبة' کا یہی معنی ملے گا۔ منجد میں ہے:

المصیبة ج مصائب ومصاوب ومصیبات، ص و ب: البلیة وکل مکروہ، آفت اور ہر ناپسندیدہ چیز۔

اقرب الموارد میں ہے:

المصیبة: البلیة والداهیة والشدة وکل أمر مکروہ یحل بالانسان، آفت، حادثہ، سختی اور وہ ناپسندیدہ چیز جس سے انسان دوچار ہوتا ہے۔

المصباح المنیر میں ہے:

المصیبة: الشدة النازلة، سخت آفت اور حادثہ۔

لسان العرب میں ہے:

الصابة والمصیبة: ماأصابك من الدهر، گردش زمانہ جس سے تم دوچار ہو۔

ان تصریحات سے یہ بات کھل کر آگئی کہ مصیبة کے معنی کسی بھی لغت میں وہ نہیں ہے جس کی جانب فاضل مکتوب نگار نے رہنمائی کی ہے۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ أصاب کا اسم فاعل مذکر اچھے اور برے دونوں معنی میں آتا ہے۔ جبکہ هو مصیب فی قوله وہ اپنی بات میں درست ہے یا اس کی بات درست ہے۔ هو مصیب فی فتواہ اس کا فتوی ٹھیک مناسب اور درست ہے مگر قرآن کریم نے اسم فاعل مذکر صرف ایک جگہ استعمال کیا ہے اور اس کا معنی بھی مصیبت ہی کا لیا گیا ہے۔ سورۃ ہود میں ہے: ﴿ولا یلتفت منکم أحد الا امرأتك انه مصیبها ما اصابهم﴾ اس آیت کا ترجمہ مولانا تھانویؒ نے اس طرح کیا ہے: اس پر بھی وہی آفت

آنے والی ہے جو اور لوگوں پر آئے گی۔ اسی طرح کا ترجمہ مولانا مودودیؒ اور دوسرے مترجمین نے بھی کیا ہے۔

۱۹۷۰ء کا واقعہ ہے، میں مدرسۃ الاصلاح میں درجہ چہارم عربی میں زیر تعلیم تھا۔ طلبہ میں خبر گرم ہوئی، سرائمیر قصبہ میں تبلیغی جماعت میں کچھ عرب علماء بھی آئے ہیں۔ میں اور مولوی ابرار صاحب اصلاحی جامع مسجد جدید میں مغرب سے پہلے ان سے ملنے گئے۔ ان کے امیر سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بڑی خندہ روئی سے ہم طلبہ کا استقبال کیا، ملاقات کے بعد سوچا گیا کہ ہم لوگ ذرا ان سے باتیں کریں، لیکن یہ نہیں سمجھ میں آرہا تھا کہ کون بات شروع کرے اور کہاں سے کرے۔ میں نے سوچا میں ہی شروع کروں، میں نے عرب عالم سے پوچھا: هل ساعتك التی فی يدك مصيبة میں کہنا چاہتا تھا کہ کیا آپ کی گھڑی ٹھیک چل رہی ہے۔ انھوں نے فوراً جواب دیا: ﴿كبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا﴾ بڑی بات ہے جو ان کے منھ سے نکلتی ہے وہ محض جھوٹ بکتے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ ہم دونوں وہاں سے سٹک لیے۔

محترم مکتوب نگار نے اپنی تائید میں یہ بھی لکھا ہے: ''چنانچہ ان ہی آیات کے آخر میں اچھی چیز اور نعمت کا ذکر موجود ہے کہ تم نعمت پا کر اتراؤ نہیں'' (حیات نو، صفحہ:۱۷) یہاں بھی موصوف سے چوک ہوگئی ہے، اور نہ جانے کیوں قرآن مجید کا ایک معروف اسلوب ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور 'ولا تفرحوا بما آتاكم' کو ما أصاب من مصيبة سے متعلق سمجھ بیٹھے، حالانکہ یہاں حذف کا اسلوب کام کر رہا ہے ما أصابكم من مصيبة کے مقابلے میں وما آتاكم من نعمة محذوف ہے جس کی علت ولا تفرحوا بما آتاكم ہے۔

یعنی آفت و مصیبت اور نعمت و رحمت دونوں مقدرات میں سے ہیں، اس لیے مصائب و آلام پر بلبلاؤ نہیں اور نعمت و رحمت پر اتراؤ نہیں، مولانا فراہی نے اس کی یہی تاویل فرمائی ہے۔ مولانا کہتے ہیں'' ههنا حذف ای ما آتاكم من نعمة الا فی كتاب''۔

(تعلیقات فی تفسیر القرآن الکریم للامام الفراہی، الجزء الثانی، اعداد: الدکتور عبید اللہ الفراہی، مراجعۃ: الشیخ امانۃ اللہ الاصلاحی، الدائرۃ الحمیدیۃ ۲۰۱۰ء)

ڈاکٹر ضیاء الرحمن فلاحی مدنی، استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ، شانتاپورم، کیرلا

آپ کی ادارت میں نکلنے والے 'حیات نو' کا دوسرا شمارہ بھی دیکھنے کو ملا۔ پرچے کا نیا رنگ و روپ دیکھ کر بے انتہا مسرت کا احساس ہوا۔ آپ نے واقعی اسے صوری اور معنوی ہر اعتبار سے خوب سے خوب تر بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہاں ہماری یونٹ کے فلاحی برادران کے علاوہ غیر فلاحی طلبہ اور اساتذہ نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ آپ کی ادارت نے مجلّے میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اب یہ مجلّہ صحیح معنوں میں جامعہ اور فارغین جامعہ کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ مجلّہ دیکھ کر ہمارے احساسات شعر کے قالب میں کچھ اس طرح ڈھل گئے کہ ؎

سفیر ''جامعہ'' بھی ہے عزیز'' انجمن'' بھی ہے
حسین وخوش نما پھولوں کا گلشن ہے ''حیات نو''!
ابوالاعلیٰ ترے حق میں مسیحا بن کے آئے ہیں
''حیات نو'' ملی تجھ کو یقیناً ہے حیات نو

مجلّے کے مشمولات پرمغز،فکرانگیز اور فلاحیوں کے افکاروجذبات کے ترجمان ہیں۔خاص طور پر راشد حامدی کی ''حمد''انگشتری میں نگینے کی طرح چمک رہی ہے۔میری گزارش ہے کہ اسی طرح دیگر فلاحی برادران جیسے عزیز نبیل(قطر) وغیرہ کی شعری تخلیقات کو بھی ''حیات نو'' کی زینت بنایا جائے۔اس کے علاوہ ڈاکٹرمحی الدین غازی فلاحی کا''اردو تراجم قرآن پرایک تنقیدی نظر''تو گویا حاصل مجلّہ ہے۔امید ہے یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔کیا ہی اچھا ہوتا اگراسے مرتب کرکے کتابی شکل میں شائع کردیا جاتا۔''امت مسلمہ کے داعیانہ کردار کی بازیافت'' سے متعلق فلاحی برادران کے خیالات جامعۃ الفلاح جیسے تحریکی ادارے کے فارغین سے وابستہ کی جانے والی توقعات کے عین مطابق ہیں۔مگر بڑے افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے فارغین مدارس،خود فلاحی برادران کی ایک بڑی تعداد اس دعوتی فکروکردار سے محروم بس دنیا کی دوڑ دھوپ میں مگن ہے۔بقول اقبالؔ عصر حاضران کا ملک الموت ہے جس نے فکر معاش دے کران کی روح قبض کرلی ہے۔آخر میں ۲رمشورے پیش خدمت ہیں:

۱)''حیات نو'' کے قارئین کا حلقہ وسیع کرکے اس کی تعداداشاعت کم ازکم دوگنی کی جانی چاہئے۔اس غرض کے لئے باقاعدہ ایک مہم چلائی جائے،اورانجمن کی تمام یونٹوں کو حرکت میں لاکراس مہم کو کامیاب بنایا جائے۔

۲)''حیات نو'' کا وقفہ اشاعت سہ ماہی سے ماہانہ کردیا جائے۔اس سلسلے میں پائی جانے والی دشواریوں پرانجمن کی شوریٰ میں غوروخوض ہونا چاہیے۔

سعود الرحمن فلاحی،حال مقیم متحدہ عرب امارات

مجلّہ کا معیار بہتر ہوا ہے۔تزئین وترتیب دلکش ہے۔مضامین اور موضوع کا انتخاب بھی اچھا ہے۔اداریہ پرمغز ہے اوراس کے لیے موضوع کا انتخاب بہت اچھا ہے۔

چند نئے کالمس کی شروعات سے فلاحی برادران کی شرکت بڑھی ہے۔کالم''پرانی یادیں'' کے تحت مولانا ابوالمکارم صاحب کا مضمون 'ہمارے زمانے کا جامعہ' پڑھا،بہت اچھا لگا،یہ سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔اس کے ذریعہ ہمیں اپنا جائزہ لینے کا موقع ملتا رہے گا۔

کیا ہی اچھا ہوکہ 'حیات نو' میں ایک کالم ایسا شروع کیا جائے جس کے ذریعہ ہمیں اپنے بزرگ اساتذہ کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملتا رہے۔چند صفحات طلبہ کے لیے بھی مختص کردیئے جائیں،تاکہ طلبائے قدیم سے ان کا ایک رابطہ قائم رہے،صفحات کے حدودوقیود اگراجازت دیں تو۔

تنویر آفاقی فلاحی، لائبریرین مرکزی لائبریری مرکز جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

حیات نو کا تازہ شمارہ آپ کی عنایت سے دیکھنے کو ملا۔ اس سے پہلے والا شمارہ بھی نظر سے گزرا تھا۔ محسوس ہوا کہ رسالے کے انداز میں کچھ نمایاں اور بہتر تبدیلی آئی ہے۔ گزشتہ اور تازہ دونوں شماروں میں خاص طور سے یہ بات اچھی لگی کہ آپ نے فلاحی برادران سے ترجیحی طور پر لکھوانے کی کوشش کی ہے، ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کہ یہ اُن ہی کا ترجمان ہے۔ مضامین کا انتخاب بھی اچھا ہے، 'فکر و آگہی' کے نام سے خصوصی کالم اگر مستقل چلتا رہے، تو بہت کارآمد چیز ہوسکتی ہے، اور مختلف اہم موضوعات پر فلاحی برادران کا موقف جاننے کا بہترین ذریعہ بھی۔ 'ہمارے زمانے کا جامعہ' کے عنوان سے مولانا ابوالمکارم فلاحی ازہری صاحب کا مضمون جامعہ کی تاریخ اور اُس وقت کے حالات جاننے کے لیے اچھی چیز ہے۔ اِس مستقل کالم کے تحت اِسی طرح کی چیزیں آتی رہیں تو آئندہ بہت مفید ثابت ہوں گی۔ جناب نسیم غازی فلاحی صاحب کا مضمون 'وہ انقلابی رات' دل کو چھونے والا، اور ہمیں اپنے فرض منصبی کا احساس دلانے والا ہے۔ مولانا محترم کی جانب سے دعوتی تجربات بھی کثرت اور پابندی سے رسالے میں آنے چاہئیں۔ رسالہ ماشاءاللہ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے اور مضامین کی کتابت اور ترتیب بھی خوب ہے۔

راشد حسن مبارکپوری، استاذ جامعہ اسلامیہ سنابل، نئی دہلی

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان 'حیات نو' اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۳ء ہمارے بزرگ محترم مولانا ابوالمکارم فلاحی ازہری حفظہ اللہ کی کرم فرمائی سے ملا، ایک استیعابی نگاہ ڈالی، مادر علمی سے وابستہ بہت سی یادیں نگاہوں میں گھوم گئیں، کچھ آشنا، کچھ نا آشنا احباب اور ہم سبق دوستوں کی تحریروں سے آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ غازی بھائی (ڈاکٹر محی الدین غازی) کا مضمون 'بیت القصید' ہے، عہد گزشتہ کی دلکش یادوں پر مشتمل مولانا ابوالمکارم فلاحی ازہری صاحب کا مضمون اس شعر کا مصداق ہے

کم نزهة فیک للناظرین

وکم راحة فیک للأنفس

'حیات نو' کی اس ظاہری و معنوی دیدہ زیب اشاعت پر روح کو نئی تازگی ملی، بس یوں سمجھئے

والغصن قد کسا الغلائل بعدما

أخذت یدا کانون فی تجریده

اگر اسے وسعت دی جائے مثال کے طور پر قرآن، احادیث، فقہ، اور شعر و ادب جیسے گوشوں کا تعین ہو جائے تو شرکت امر مستحیل نہیں۔ بقیہ حالات بدستور ہیں، فقط والسلام

جامعہ کے لیل و نہار

مصباح الباری فلاحی، استاذ شعبۂ اعلیٰ، جامعۃ الفلاح

حکیم محمد ایوب میموریل ایوارڈ ۲۰۱۳ء

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی جانب سے گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی جامعہ کے ممتاز طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے تقسیم انعامات کا پروگرام رکھا گیا، جامعہ میں تقسیم انعامات کا یہ پروگرام ۱۶ر دسمبر ۲۰۱۳ء کو مودودیؒ منزل اور حسن البناؒ منزل کے سامنے واقع پارک میں بہت ہی اہتمام کے ساتھ منعقد ہوا۔ جس میں طلبہ وطالبات کے ساتھ ساتھ اساتذہ ومعلمات نے بھرپور دلچسپی کے ساتھ شرکت کی۔ اس موقع پر جامعہ کی مجلس شوری کے موقر ممبران کے علاوہ انجمن طلبہ قدیم کی نومنتخب مجلس شوری کے ارکان اور جدید وقدیم ذمہ داران بھی موجود تھے۔ جناب رضوان احمد رفیقی فلاحی کی نظامت میں شروع ہونے والے اس جلسہ تقسیم اسناد کے آغاز میں طلبہ وطالبات جامعہ نے اپنی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کیا، جس میں عربی، اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں تقاریر ہوئیں۔

کلیدی خطاب ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کا ہوا، موصوف نے اپنے خطاب میں حکیم محمد ایوب صاحب مرحوم کی حیات وخدمات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آپ کی شخصیت ایک شجر ہائے سایہ دار کی طرح تھی، انسانوں کی خدمت آپ کا مشن تھا، آپ جامعہ کے موسسین میں سے تھے، اور جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے آپ نے اپنا خون پسینہ سب ایک کر دیا تھا۔ اسی طرح ناظم جامعہ نے فارغین جامعہ کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے انجمن طلبہ قدیم کی جانب سے جامعہ کی تعمیر وترقی میں اہم اور کلیدی رول پر ہدیہ تشکر بھی پیش کیا۔ نیپال سے تشریف لائے ہوئے اسلامک سنگھ نیپال کے جنرل سکریٹری جناب عارف حسین فلاحی صاحب نے طلبہ وطالبات اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب داعی ہیں، اور اس دنیا کی تعمیر نو کے لیے ہم سب کو اپنی زندگیاں لگا دینی ہیں، ہمیں انسانیت کے لیے محسن کا کردار ادا کرنا ہے، اور پوری دنیا میں اسلام کا پیغام رحمت عام کرنا ہے۔

اس کے بعد پوزیشن ہولڈر طلبہ وطالبات کوانعامات تقسیم کئے گئے، جس کے بعد جناب رضوان احمد فلاحی صاحب (حال مقیم لندن) اور استاذ الاساتذہ جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی (دامت برکاتہم) نے خطاب کیا۔صدارتی خطاب کرتے ہوئے سابق صدرانجمن ڈاکٹر ملک محمد فیصل فلاحی نے کہا کہ طلبہ جامعہ کے عزائم بہت بلند ہونے چاہئیں، ان سے ملت اسلامیہ ہند کی بہت کچھ توقعات وابستہ ہیں، یقیناً ملک وملت کی تعمیر وترقی میں طلبہ جامعہ کوایک مثبت اور فعال کردارادا کرنے کے لیے میدان میں آنا ہوگا۔

آخر میں مہتمم تعلیم وتربیت جناب مولانا رحمت اللہ اثری فلاحی صاحب نے حکیم محمد ایوب میموریل ایوارڈ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جناب مولانا نسیم غازی فلاحی، جناب وسیم احمد غازی فلاحی اور جناب نعیم غازی فلاحی کی جامعہ سے وابستگی اور جامعہ کی تعمیر وترقی کے لیے اِن افراد کی مستقل بے چینی کا تذکرہ کیا، اور طلبہ جامعہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یقیناً ہمارااصل کام دین کی خدمت ہے اور جامعہ اسی کا جذبہ اور لگن آپ کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔

جامعہ کی مرکزی لائبریری میں بہار ہی بہار

''گزشتہ دنوں سابق معلّمہ کلیۃ البنات محترمہ سمیہ سبحانی فلاحی صاحبہ (ریاض) اور سابق استاذ جامعۃ الفلاح جناب مولانا جاوید سلطان خاں فلاحی (ریاض) کی کوششوں سے ایک عرب خاتون نے جامعہ کی مرکزی لائبریری کے لیے کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ ہدیہ کیا، فجزاھم اللہ خیرالجزاء۔جامعہ میں تقریباً ڈھائی ہزار مصادر کے قسم کی کتابوں کی آمد سے مرکزی لائبریری میں یقیناً بہار کا سماں چھا گیا''۔ان خیالات کا اظہار جناب عرفان احمد فلاحی لائبریرین مرکزی لائبریری جامعۃ الفلاح نے کیا۔کتابوں کے اس ذخیرے میں قدیم وجدید عربی تفاسیر، شروح احادیث، تاریخ اسلام، اسماء رجال، اور مختلف فنون پر بہت ہی قیمتی اور اہم کتابیں موجود ہیں۔ان کتابوں کی ترتیب کا کام جاری ہے، یہ کتابیں مرکزی لائبریری کے ریڈنگ روم میں لگائی جارہی ہیں تاکہ طلبہ واساتذہ کے لیے استفادہ آسان سے آسان تر ہوسکے۔

معروف مفسر قرآن سید حامد عبدالرحمٰن الکاف کی جامعہ آمد

۱۸؍دسمبر ۲۰۱۳ء بروز چہار شنبہ معروف مفسر قرآن جناب مولانا سید حامد عبدالرحمٰن الکاف (صنعاء، یمن) کی جامعہ آمد کے موقع پر ابواللیث ہال میں طلبہ واساتذہ کے ساتھ موصوف کا ایک خطاب رکھا گیا۔موصوف جماعت اسلامی ہند کی قائم کردہ ثانوی درسگاہ سے فارغ ہیں، تفسیر قرآن میں فراہی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، اور انگریزی زبان میں آپ کی متعدد اہم علمی وتحقیقی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔طلبہ واساتذہ کے سامنے موصوف نے اپنے اسلوبِ ترجمہ وتفسیر کی بنیادی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا کہ (۱) میں نے اپنے ترجمہ وتفسیر میں نظم قرآن کا پورا پورا اہتمام کیا ہے، اور آیات کے

باہمی ربط کا پورا پورا لحاظ کیا ہے۔(۲) علامہ فراہیؒ، مولانا مودودیؒ اور سید قطبؒ کے افکار وخیالات سے خوب استفادہ کیا ہے۔(۳) گراف کے ذریعہ مطالب ومفاہیم کی وضاحت کی کوشش کی ہے۔(۴) سید قطب کے پیش کردہ نظریہ تصویر فنی کا بھی اہتمام کرنے کی کوشش کی ہے۔(۵) کلمات کی صحیح تعبیر وتشریح تک پہنچنے کی بھی کوشش رہی ہے۔موصوف کی گفتگو کے بعد طلبہ واساتذہ کی جانب سے مختلف سوالات سامنے آئے، بالآخر ناظم جامعہ کی گفتگو پر یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

قاضی اشفاق احمد صاحب (آسٹریلیا) کا طلبہ جامعہ سے خطاب

۱۹؍دسمبر بروز پنجشنبہ جامعہ میں جناب قاضی اشفاق احمد صاحب حال مقیم آسٹریلیا تشریف لائے، موصوف ثانوی درسگاہ کے ممتاز فارغین میں سے ہیں، اور ایک زمانے سے آسٹریلیا میں دعوت دین کے محاذ پر کافی نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔موصوف نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن مجید صرف عرب دنیا کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانیت کے لیے رب العالمین کی طرف سے پیغامِ ہدایت ہے۔موصوف نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں امت کے اندر اجتماعی شعور بیدار کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔موصوف نے کہا کہ اس وقت دنیا ایک فکری انقلاب کی پیاسی ہے، جس کے لیے ہمیں اپنے اپنے میدان میں مہارت حاصل کرنی ہوگی۔موصوف کے خطاب کے بعد سوال وجواب کا بھی اہتمام کیا گیا، اور آخر میں جناب سید عبدالرحمٰن الکاف صاحب کی دعا پر مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

جناب عبدالسلام صاحب (حیدرآباد) کا طلبہ جامعہ سے خطاب

۱۹؍دسمبر ۲۰۱۳ء بعد نماز مغرب طلبہ کا ایک مشترک پروگرام ہوا، جس میں سابق صدر حلقہ ایس آئی او یوپی مشرق جناب اسد اللہ اعظمی اور جناب عبدالسلام صاحب حیدرآباد کا خطاب ہوا۔جناب اسد اللہ اعظمی نے طلبہ کو ان کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ حالات کا رونا رونے کے بجائے حالات کو اپنے موافق بناتے ہوئے کام کرنے کی ضرورت ہے، روشن مستقبل کی طرف پیش قدمی کے لیے طلبہ کو آگے بڑھنا ہوگا۔جناب عبدالسلام صاحب نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب کو اپنی زندگیاں اسلام کے لیے لگانی ہوں گی، آج جدید ٹکنالوجی کے ذریعہ سماج میں برائیاں عام ہو رہی ہیں، ہمیں ان کا صحیح استعمال کرنے کے لیے میدان سنبھالنا ہوگا، اسلام کی دعوت کا کام سماج سے کٹ کر انجام نہیں دیا جاسکتا، ہم کو ایک بامقصد زندگی کی طرف پیش قدمی کرنی ہوگی، اگر ہمارا کوئی مقصد نہیں تو یقین مانئے اس بے مقصد زندگی سے موت بہتر ہے۔آخر میں ناظم جامعہ کی گفتگو اور دعا پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

جامعہ میں ششماہی امتحانات

جامعہ کے تعلیمی کلینڈر کے مطابق ششماہی امتحانات کا آغاز ۲۶؍دسمبر ۲۰۱۳ء بروز پنجشنبہ کو ہوا،

۲؍جنوری تک یہ امتحانات روزانہ دو نشستوں میں جاری رہے۔

جامعہ میں تعطیل سرما

اعلان کے مطابق جامعہ میں ششماہی امتحانات کے بعد ۴؍جنوری تا ۲۶؍جنوری ۲۰۱۴ء تعطیل سرما ہوئیں، طویل تعطیل کے سبب تقریباً تمام ہی طلبہ نے اپنے اپنے گھروں کا رخ کیا، اور ۲۷؍جنوری ۲۰۱۴ء بروز دوشنبہ دوسری ششماہی کا آغاز ہوگیا۔

ذکر رفتگاں

گزشتہ دنوں عظیم مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کے صاحبزادے جناب ابوسعد اصلاحی اس دار فانی سے کوچ کر گئے، موصوف اعظم گڑھ کے قصبہ بمہور کے رہنے والے تھے۔ جامعہ سے مولانا نظام الدین اصلاحی، مولانا سلامت اللہ اصلاحی اور مولانا مطیع اللہ فلاحی نے نماز جنازہ میں شرکت کی، نماز جنازہ جناب مولانا عبدالحسیب اصلاحی نے پڑھائی۔

سابق ناظم جامعہ جناب ڈاکٹر خلیل صاحب کی اہلیہ بھی ایک طویل علالت کے بعد مالک حقیقی سے جاملیں، مرحومہ کی نماز جنازہ میں جامعہ کے طلبہ واساتذہ کی بڑی تعداد شریک رہی۔

جامعہ میں ایک طویل عرصہ سے طالبات کی نگران اعلی رہیں محترمہ شاہجہاں باجی بھی طویل علالت کے بعد ۷؍جنوری کو داغ مفارقت دے گئیں، مرحومہ فیض آباد یوپی کی رہنے والی تھیں اور جامعہ سے بہت ہی والہانہ لگاؤ رکھتی تھیں، اسی طرح طالبات جامعہ وفارغات جامعہ بھی ان کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔

ناظم جامعہ جناب مولانا محمد طاہر مدنی صاحب کے بہنوئی اور استاذ جامعہ جناب مولانا رئیس احمد فلاحی (نیوتنی، اناؤ) کے سسر جناب زبیر فلاحی صاحب ۷؍جنوری کو مالک حقیقی سے جاملے، مرحوم رکن جماعت تھے، جامعہ میں انگریزی کے استاذ بھی رہے، تقریباً دو سال قبل فالج سے متأثر ہوئے، جس کے بعد سے کافی بیمار رہنے لگے تھے۔

استاذ جامعہ جناب مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب کی والدہ محترمہ بھی تقریباً ۸۵؍سال کی عمر میں ۱۹؍جنوری کو اپنے وطن مئو میں اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

ڈاکٹر لئیق احمد فلاحی بھی گزشتہ دنوں اس دار فانی سے کوچ کر گئے، موصوف اعظم گڑھ کے معروف قصبہ بسہم کے رہنے والے تھے، اور جامعہ سے ۱۹۹۶ء میں فراغت حاصل کی تھی۔

ادارہ حیات نو مرحومین کے لیے دعائے مغفرت اور پسماندگان کے لیے دعائے صبر جمیل کی درخواست کرتا ہے، اللہ رب العزت مرحومین کی مغفرت فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق شمرحمت فرمائے، انا للہ وانا الیہ راجعون

انجمن کے نئے انتخابات: رضوان رفیقی فلاحی صدر منتخب

۱۴/۱۵/دسمبر ۲۰۱۳ء کو انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کی نو منتخب مجلس نمائندگان کا پہلا اجلاس مادر علمی جامعۃ الفلاح میں ہوا۔ جس میں انجمن کی کارکردگی کے جائزہ کے ساتھ ساتھ دستور کے اوپر تفصیل سے گفتگو ہوئی اور مختلف ترامیم بھی عمل میں آئیں، اس اجلاس میں ترمیم شدہ دستور کے مطابق پہلے انجمن کی نئی مجلس شوری کا انتخاب عمل میں آیا، اور اس کے بعد صدر انجمن کا انتخاب کیا گیا۔

نئی میقات کے لیے جناب رضوان احمد رفیقی فلاحی صدر انجمن منتخب کیے گئے، موصوف گزشتہ میقات میں سکریٹری انجمن کے طور پر اپنی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ موصوف نے جامعۃ الفلاح سے فضیلت کے بعد کچھ عرصہ تک وہیں تدریسی خدمات انجام دیں، بعد ازاں جامعۃ الامام تشریف لے گئے، وہاں سے بی اے کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا، اور اب وہیں سے پی ایچ ڈی کر رہے ہیں، حالیہ دنوں موصوف ہمہ وقتی طور پر ہیومن ویلفیئر فاؤنڈیشن نئی دہلی سے وابستہ ہیں۔

نئی مجلس شوری کا انتخاب

میقات نو کے لیے منتخب مجلس شوری کے ممبران کے نام کچھ اس طرح ہیں:

۱۔مشرف حسین صدیقی	دہلی	۱۲۔ولی اللہ سعیدی فلاحی	لکھنؤ
۲۔ملک فیصل فلاحی	لکھنؤ	۱۳۔قاسم رسول فلاحی	راجستھان
۳۔نعیم غازی فلاحی	دہلی	۱۴۔ابوالاعلی سید سبحانی	دہلی
۴۔محمد یونس فلاحی	بھساول	۱۵۔انعام اللہ فلاحی	دہلی
۵۔صباح الدین ملک فلاحی	بہار	۱۶۔ادہم علی	ممبئی
۶۔مجاہد شبیر فلاحی	کشمیر	۱۷۔انیس احمد مدنی	فلاح
۷۔محمد عمران فلاحی	فلاح	۱۸۔اظہر الدین فلاحی	بستی
۸۔رحمت اللہ اثری فلاحی	فلاح	۱۹۔سید راشد حامدی فلاحی	دہلی
۹۔اوصاف احمد فلاحی	ممبئی	۲۰۔الیاس اکولوی فلاحی	مہاراشٹر
۱۰۔دانش ریاض فلاحی	ممبئی	۲۱۔ضیاء الدین ملک فلاحی	علی گڑھ
۱۱۔شمشاد حسین فلاحی	دہلی		

سکریٹری اور خازن کا تقرر

صدر انجمن نے نومنتخب مجلس شوری کے مشورے سے ضمیر الحسن خاں فلاحی (سابق استاذ تفسیر و ادب جامعۃ الفلاح، واسکالر ادارہ تحقیق وتصنیف علی گڑھ) کو انجمن کا سکریٹری، اور حکیم ابوذر فلاحی (شاہین باغ، نئی دہلی) کو نئی میقات کے لیے انجمن کا خازن مقرر کیا ہے۔

دستور میں ترمیم

مجلس نمائندگان کے اجلاس ۱۴/۱۵/دسمبر ۲۰۱۳ء کے پہلے سیشن میں انجمن کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ دستور انجمن میں ترمیم کے سلسلے میں آنے والی تجاویز بھی زیر غور آئیں، نمائندگان کے اس اجلاس میں دستور انجمن میں درج ذیل ترامیم منظور کی گئیں:

(۱) 'دفعہ ۷' میں فرائض و اختیارات سے پہلے اضافہ کیا جائے گا:

''حسب ضرورت مجلس نمائندگان کا اجلاس درمیان میقات میں بھی بلایا جاسکتا ہے۔''

(۲) 'دفعہ ۷/الف' جواب تک اس طرح تھی کہ ''صدر اور شوری کا انتخاب کرنا''، ترمیم کے بعد اس طرح ہوگی:

''پہلے مجلس شوری اور اس کے بعد صدر کا انتخاب کرنا۔''

(۳) 'دفعہ ۸' میں مجلس کے ممبران کی تعداد کا ذکر کچھ اس طرح تھا کہ ''اس مجلس کے ممبران کی تعداد پندرہ ہوگی''، ترمیم کے بعد اب یہ اس طرح ہوگا:

''اس مجلس کے ممبران کی تعداد اکیس ہوگی۔''

(۴) 'دفعہ ۱۶/کی شق ج' /اب تک اس طرح تھی کہ ''انجمن کا کوئی ممبر بیک وقت انجمن کے عہدوں (صدر، سکریٹری) اور جامعۃ الفلاح کے عہدوں (شیخ الجامعہ، ناظم جامعہ، نائب ناظم اور مہتمم جامعہ) کو قبول نہیں کرسکتا۔'' ترمیم کے بعد یہ شق اس طرح ہوگی:

''انجمن کا کوئی ممبر بیک وقت انجمن اور جامعۃ الفلاح کا کوئی عہدہ قبول نہیں کرسکتا۔''

(۵) نئی ترمیم میں دستور کی 'دفعہ ۱۶/کی شق ج' کے بعد ایک شق 'د' کا اضافہ کیا گیا، وہ اس طرح ہے:

''کسی دستوری خلاف ورزی کی صورت میں متعلقہ عہدیداران کم از کم ایک میقات کے لیے کسی بھی عہدے کے انتخاب کی اہلیت سے محروم ہوجائیں گے۔ عہدے سے مراد معروف عہدوں کے علاوہ مجلس شوری کی رکنیت بھی ہے۔''